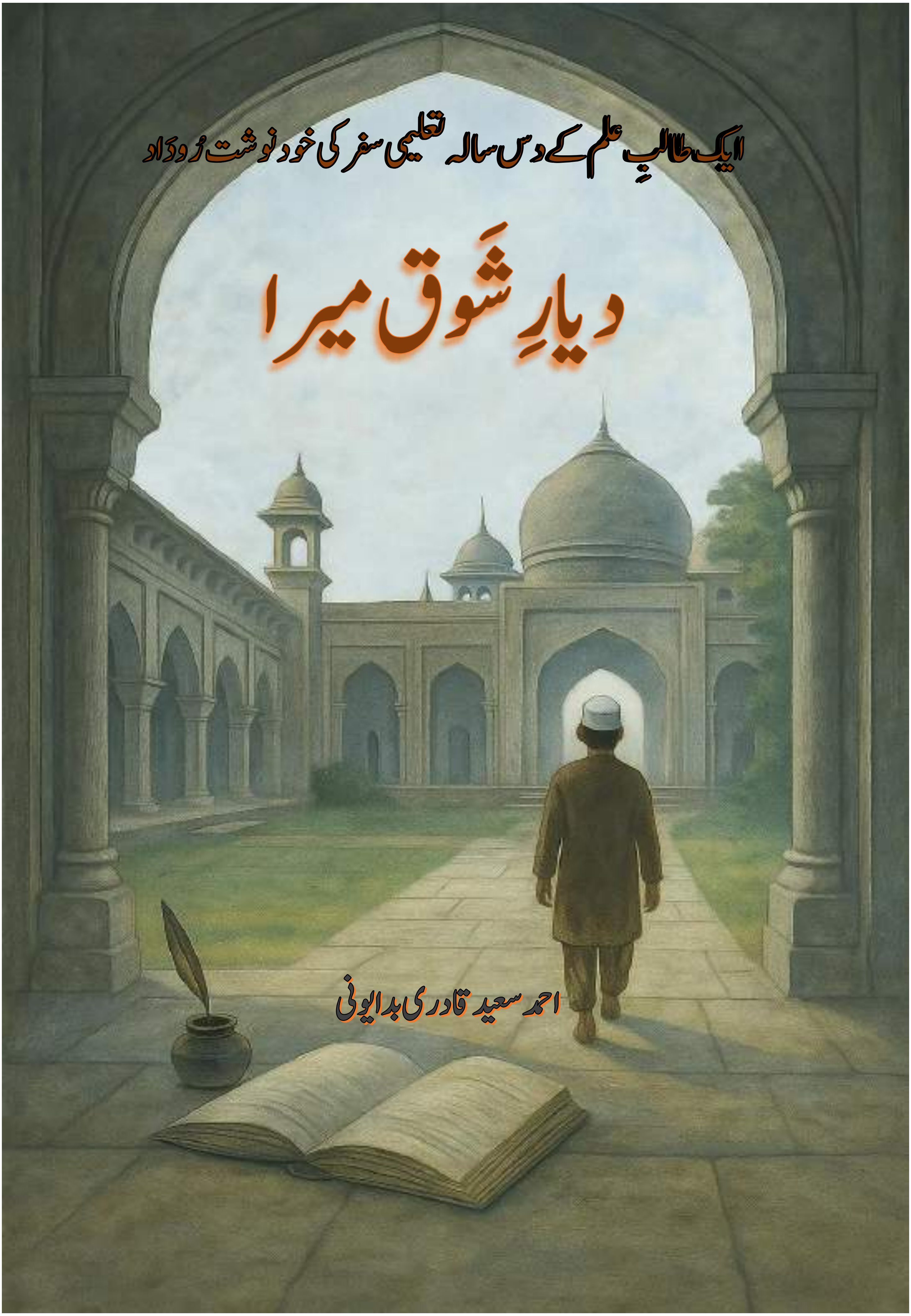

ایک طالبِ علم کے دس سالہ تعلیمی سفر کی خود نوشت رُودَاد
دیارِ شَوق میرا
احمد سعید قادری بدایونی

انتساب

ان کے نام۔۔

جو خاموشی سے زندگی کے راستے روشن کرتے رہے،

جن کی دعاؤں نے ہر ناکامی کو کامیابی میں بدلا،

اور

جن کی آغوش نے مجھے کتاب، قلم اور خواب عطا کئے—

ابّا، امی، اور مادرِ علمی: مدرسہ عالیہ قادریہ، بدایوں۔

مقدمہ:

خواب، دیوانگی اور یاد کی دھند

کہتے ہیں دیوانے کے خواب بھی خاص ہوتے ہیں — بے ربط، بے سمت، مگر دل کی سرحدوں سے لپٹے ہوئے۔ میرے تعلیمی سفر کے دس برس، بظاہر تو تاریخ کے صفحات پر گنتی کے سال ہیں، مگر دراصل یہ خوابوں کی تعبیریں، دیوانگی کی دلیلیں، اور یاد کی دھند سے لپٹے وہ لمحے ہیں جو روح کی تہوں میں جا بسے ہیں۔ یہ وہ دیار تھا جہاں ہر قدم، خواہ وہ علم کی جستجو میں اٹھا ہو یا غلطی کی خاک میں گرا ہو، ایک شوق کی لو میں تپتا رہا۔

یاد بھی ایک عجیب شے ہے۔ یہ کبھی مہک کی صورت آتی ہے، کبھی ایک ہلکی سی چبھن بن کر دل کو چھو جاتی ہے۔ مگر جب دیوانگی شامل ہو جائے، تو یادیں محض عکس نہیں رہتیں — وہ شور کرتی ہیں، سوال کرتی ہیں، اور کبھی کبھی خاموشی میں بھی بولنے لگتی ہیں۔ شاید اسی لئے یہ مقدمہ محض تعارف نہیں بلکہ ایک اعتراف بھی ہے — کہ یہ سفر صرف مدارس، درسیات، جماعتوں یا درجات کا نہیں، بلکہ ایک اندرونی طے شدہ راستے کا بھی تھا جس پر "میں" خود سے ملا، خود سے بچھڑا، اور پھر کچھ سیکھ کر آگے بڑھا۔

ویسے مرحوم فانؔی بدایونی کہہ گئے ہیں:

زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اب "کاہے کو ہے" سے تو ہمیں کوئی خاص سروکار نہیں البتہ "خواب ہے دیوانے کا" خاصی دلچسپ بات ہے، کیونکہ ایک تو یہ خواب ہے اور وہ بھی ایک دیوانے کا: مطلب دو دھاری تلوار: ایک خوابی دنیا کی آزادی اور دوسری شوق کی دیوانگی، بلکہ میرے خیال میں اس قاتلانہ امتزاج کا مزہ صرف وہی انسان بتا سکتا ہے جس کی نہ نیتِ شوق بھری ہو اور نہ خیالِ یار و یاد داشتِ ماضی پردۂ ذہن سے مضمحل: کیونکہ ماضی کے جھروکوں سے آنے والی ہوائیں کبھی تو نسیمِ صبح کی مانند باعث تسکین ہوتی ہیں تو کبھی صحرا میں گشت کرتی بادِ سموم کی طرح پورے وجود کو جھلسا دیتی ہیں، اس میں زلفِ یار کا سلجھنا بھی ہوتا ہے اور گیسوؤں کا الجھنا بھی۔ وقت کے جھرنے سے گر کر فنا کی اَنت کھائی میں ہمیشہ ہمیش کے لئے روپوش ہونے والے لمحات کی زنجیر میں جکڑیں دھیمی اور گرم انفاس کی پاداش میں وقوع

پذیر ہونے والے حوادثات میں طلسم خواب زلیخہ بھی ہوتا ہے اور دام بردہ فروش بھی، مطلب کہ حافظ صاحب نے صحیح کہا تھا:

دست در حلقہ آں زلفِ دوتا نتوان کرد

تکیہ بر عہدِ تو و بادِ صبا نتوان کرد

یعنی نہ تو بادِ صبا لائق اعتبار ہے اور نہ ہی کسی کا وعدۂ فردا، بقول رونقؔ بدایونی:

کسی کے وعدۂ فردا کا اعتبار کرو

غرض یہ ہے کہ قیامت کا انتظار کرو

خیر! وہ قیامت جب آئے گی تب آئے گی لیکن تاہنوز، وقت نے کئی چہرے بدلے، کئی موسم گزرے، کئی خواب بکھرے اور کچھ تعبیر بھی ہوئے۔ ان سب کے بیچ کہیں ایک طالب علم — جسے کبھی استاد کی ڈانٹ نے رُلایا، کبھی دوست کی ہنسی نے بہلایا — اپنی راہ چپ چاپ بناتا رہا۔ اُس وقت تو شاید سمجھ نہ آیا ہو، مگر آج، ماضی کے جھروکے سے دیکھتا ہوں تو ہر لمحہ جیسے کچھ کہتا ہے، کچھ مانگتا ہے — ایک آج کی طرح جو ماضی کی کوکھ سے پیدا ہوا ہو۔

یہ خودنوشت تعلیمی روداد لکھنے کا فیصلہ، درحقیقت اس دیوانگی کی گونج ہے جو اُس دور میں بھی ساتھ تھی اور آج بھی قائم ہے۔ معروف فرانس نژاد امریکی روزنامچہ نویس، محترمہ انائیس نن کا کہنا تھا کہ "خودنوشت کے لئے ڈائری لکھنا لازمی ہے"، مگر میرے لئے، یاد کی دھند ہی سب سے بڑی ڈائری ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے روزنامچے نہیں لکھے، مگر میرے دل نے ہر منظر کو محفوظ رکھا، جیسے خاموشی کی کسی سلیٹ پر وقت نے انگلی سے الفاظ لکھ دئے ہوں۔

اب رہی بات روزنامچہ لکھنے کی، تو میں بس اتنا کہوں گا کہ روزنامچہ، واقعات و حادثات کی زمانی ترتیب اور تسلسل کو محفوظ رکھنے میں معاون ہو سکتا ہے، لیکن اپنی کہانی، اپنی زبانی سنانے کے لئے کوئی لازمی شرط ہرگز نہیں۔

سو، یہ تحریر نہ کسی وضاحت کا بوجھ ہے، نہ کسی شہادت کی خواہش۔ نہ ہی یہ کوئی تاریخی دستاویز ہے، اور نہ

ہی واقعات و حادثات کا زمانی تسلسل رکھنے والا کوئی بیانیہ۔ یہ محض ایک کوشش ہے۔۔۔اپنی کہانی، اپنی زبانی سنانے کی۔ جس میں اردو مزاحیہ اور سنجیدہ نثر کے بیچ کی باریک اور پر خطر سرحد پر چلنے کا جوکھم بھی اٹھایا گیا ہے اور شائستگی و ظرافت کو ہم آہنگی سے برتنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔

اس تحریر کے جملے صرف لکھے نہیں گئے ہیں بلکہ انہیں کاتا گیا ہے اور وہ بھی دل کی سوت سے، اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی قاری، کہیں اپنے سفر کو اس میں تلاش کرے۔ شاید کسی لمحے کو میں، کسی کی آنکھ میں پھر سے زندہ ہوتے دیکھوں، کیونکہ:

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر سرِ عام رکھ دیا

احمد سعید قادری بدایونی

وہ خلدِ بریں آرمانوں کی

ارے! آپ کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟ اِدھر آیئے، آج ہم آپ کو اپنی مادرِ علمی، "**مدرسہ عالیہ قادریہ**" کی سیر کراتے ہیں۔

مولوی ٹولہ کا راستہ:

اَماں! آیئے میاں، شرمائیں نہ، اب چلیں بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ بس جامع مسجد کے صدر دروازے سے تھوڑا آگے بڑھ کر، بائیں اَور مڑیں اور پھر سیدھے چلتے رہیں، لو بھئی، پہونچ گئے۔

تو یہ ہے بدایوں شہر کے وسط میں واقع "محلّہ مولوی ٹولہ"۔ اب ذرا ایک منٹ یہی رو کیں اور اپنی بائیں طرف دیکھیں، یہ جو سفید رنگ کا گھونگٹ لئے ۱۴ فٹ اونچی چار دیواری نظر آرہی ہے، یہ ہے ہماری مادرِ علمی کا باہری حصّہ اور یہ جو شٹر لگا، دوکان نما کمرہ دِکھ رہا ہے، یہ گیراج ہے، جہاں حضرت اقدس کی گاڑھی کھڑی ہوتی ہے اور وہ جو ہرے رنگ کی چادر اوڑھے کوئی چھ فٹ لمبا اور ساڑھے تین فٹ چوڑا دروازہ نظر آرہا ہے، یہ ہے ہمارے مدرسے کا صدر دروازہ۔

عجیب حال ہے بھئی! میں آپ کو بائیں طرف دیکھنے بول رہا ہوں اور آپ دائیں جانب نظر جمائے کھڑے ہیں؟ اگر آپ کو دائیں طرف، آمنے سامنے واقع اِن دو حویلیوں کے بابت جاننے کا اشتیاق ہو رہا تھا تو پوچھ لیتے۔

خیر! دائیں طرف مڑنے کے بعد جو مشرق کی سمت میں سفید رنگ کی حویلی ہے یہ حضرت صاحب سجّادہ کا دولت کدہ ہے جس کو "حویلی شاہ مطیع الرسولؒ" کہتے ہیں اور اس کے بالکل سامنے جو پیلے رنگ کی حویلی نظر آرہی ہے وہ بھی حضرت صاحب سجّادہ ہی کی ملکیت ہے اور "حویلی شاہ عین الحقؒ" کے نام سے موسوم ہے۔

اب کیا ہوا؟ اب آپ کن سوچوں میں گم ہو گئے؟ اوہ! سمجھا، آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اب تو مدرسہ "درگاہ قادری" کے سامنے واقع "دیوان خانہ" میں منتقل ہو گیا ہے، پھر میں کس مدرسے کی بات کر رہا ہوں؟ اماں میاں ابھی ہم ۲۰۲۱ء میں نہیں، بلکہ ۲۰۰۵ء میں ہیں۔ یا پھر وقت تھم سا گیا ہے؟ خدا جانے! مجھے بھی نہیں معلوم کہ یہ ۲۰۰۵ء ہے یا آج کا دن یا پھر کوئی تیسری دنیا ہے، جہاں صرف یادر ہتی ہے اور میں۔

مادرِ علمی کی دہلیز پر:

ذرا سامنے دیکھیں، یہ لال اٹیچی تھامے جو دس برس کا دبلا پتلا بچہ آہستہ آہستہ دروازے کے اندر داخل ہو رہا ہے،،جی ہاں، وہی، وہ میں ہوں۔ آیئے، جلدی سے میرے پیچھے آیئے۔ ابھی آپ کو مدرسے کے اندر کی عمارت بھی تو دکھانا ہے۔

اِدھر دیکھیں! جی جی، صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد، چار پانچ قدم چلیں، پھر اپنے اُلٹے ہاتھ کی طرف۔ پرفیکٹ، بالکل اِسی دِشا میں۔ تو یہ ہے، ہمارا حاجی پارک؛ جس میں درخت کے نام پر ایک قدیم پیتے کا پیڑ ہے اور ایک بیل کا۔ ویسے اصل میں یہ کوئی پارک نہیں ہے بس تھوڑی سی کھلی جگہ ہے، جہاں بادشاہ بھائی (خادمِ مدرسہ) کا ٹھیلا کھڑا رہتا تھا لیکن جب بادشاہ بھائی حج کر کے لوٹے تو وہ حاجی ہو گئے اور اُن کی نسبت سے یہ خزاں رسیدہ بنجر خطۂ ارضی "حاجی پارک"۔ حاجی پارک میں عصر کے بعد طلبہ کبھی کرکٹ کھیلتے تو کبھی یونہی بیٹھ کر وقت گزاری کر لیتے۔ یہ حاجی پارک میں جو آپ کو نسوانی اور مردانہ ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، یہ شرافت بھائی کے گھر سے آرہیں ہے، ویسے تو یہ گھر بھی حضرت اقدس کا ہی ہے، لیکن اُس میں رہتے شرافت بھائی اینڈ فیملی ہیں۔

حاجی پارک کے بالکل سامنے مدرسے کا کچن ہے اور یہ جو میانہ قد، کلین شیو، اونچا کرتہ اور بڑی موری کا پائجامہ پہنے کچن کے دروازے پر کھڑے ہیں، یہ ہیں "واحد بھائی" ہمارے خانساماں اور اُن کی نگاہیں جن کے وجود مسعود کا تعاقب کر رہی ہیں وہ ہیں "نہال بھائی"؛ حاجی پارک والے بادشاہ بھائی کے صاحبزادے۔ کچن سے تھوڑا سا آگے بڑھ کر سیدھی طرف آپ کو جو یہ دو کمرے نظر آرہے ہیں؛ اُن میں سے پہلا والا اناج کا گودام ہے اور دوسرا والا نہال بھائی کی قیام گاہ؛ چونکہ یہ دونوں کمرے پرانی طرز پر تعمیر کئے ہوئے ہیں، اس لئے دوسرے کمروں کی بنسبت بہت زیادہ ٹھنڈے رہتے ہیں۔ اب گودام میں تو کوئی جا کر لیٹ بیٹھ نہیں سکتا لہٰذا گرمیوں میں نہال بھائی کے کچھ قریبی طلبہ آرام کرنے کے لئے نہال بھائی کے کمرے کا انتخاب کرتے ہیں؛ جہاں آرام کم اور تفریح زیادہ ہوتی ہے۔

بیت البرق کے مکین اور ہم:

جی؟ اچھا! یہ صدر دروازے کے بالکل سامنے، راہداری کے کونے والا کمرہ؟ اِس کو ہم سب "بجلی والا

کمرہ" کہتے ہیں؛ حالانکہ یوں تو یہ کمرہ اسم بمسمّٰی ہے پھر بھی آپ کہہ رہے ہیں تو بتا دیتا ہوں کہ مدرسے میں بجلی سپلائی کا فیضان اسی کمرے سے جاری ہوتا ہے اور خدا نا خواستہ اگر اس " برقی فیضان " کا چشمہ بند ہو جائے تو انویٹر کے چلنے نہ چلنے پر پورے مدرسے کی راحت و مصیبت کا انحصار ہوتا ہے—— گویا وہ کوئی غیر اعلانیہ متہم ہو۔ ارے بھائی! اب آپ بجلی والے کمرے کے اندر جا کر کیا کریں گے؟ اچھّا! چلیئے، یہ لیں، یہ رہا آپ کا بجلی والا کمرہ اور یہ رہا "الیکٹر کسٹی سپلائی باکس" باکس پر لگی لال اور ہری بتّیاں دیکھ رہے ہیں، یہ بجلی کی موت و حیات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اُف! یہ دیکھیں! یہ بجلی کے بکھرے الجھے تار، محبوبہ کی سر کردہ زلفوں سے کم نہیں ہیں اور میاں ہم ٹھہرے چچا غالب کے دلداہ، ہم تو محبوبہ کی الجھی زلفوں کو دیکھ کر بھی "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک" کہہ کر چلے آتے ہیں؛ پھر اِن بجلی کے تاروں کی کیا اوقات۔ ہاں! ہمارے " بابو بھائی" ہیں، جو اِن زلفِ جاناں سی پریشان و سر کردہ بجلی کے تاروں کو سنوارنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اِس لئے ہم اُن کے حق میں دستبر دار ہوتے ہیں۔

حد ہے صاحب، اِن کمبخت الجھے تاروں نے اِس "بیت البرق" سے منسوب، دو نفوسِ قدسیہ نصیر الدین اڑیسوی اور شکیل ککرالوی سے غفلت میں ڈال دیا۔ خیر رب قدیر کا شکر ہے کہ کمرے سے نکلنے سے پہلا یاد آ گئے۔ نصیر (شعبۂ درسِ نظامی) اور شکیل (شعبۂ حفظ) اسی بجلی والے کمرے میں رہتے ہیں اور ایمر جنسی میں پانی کا موٹر چلانا، بھی ایک طرح سے ان کے معمول کا حصّہ ہے۔

مسجد خرمہ کی جھلکیاں:

یہ مدرسے کے مین ڈور اور بجلی والے کمرے کی باہری دیوار تک جو اینٹرنس پیسج (Entrance Passage) راہداری ہے، اس کے دائیں طرف دیکھیں، یہ مسجدِ خُرمہ ہے؛ خُرمہ کھجور کو کہتے ہیں اور چونکہ مسجد کے صحن میں کھجور کا درخت ہے، اس لئے اس کا نام مسجدِ خُرمہ پڑ گیا۔ یہ جو پیسج کی طرف چھوٹی سی دیوار نظر آ رہی ہے، یہ وضو خانے کی دیوار ہے، ابھی جب آپ اندر جائیں گے، تب صحیح سے دکھاتا ہوں۔

پیسج سے نکل کر جیسے ہی آپ مڑیں گے تو آپ کو شمال میں مسجد اور جنوب میں مدرسے کی پر شکوہ عمارت نظر آئے گی اور اگر آپ دائیں بائیں مڑے بغیر اپنا قبلہ درست رکھتے ہوئے، سیدھے آئیں گے، تو سامنے آپ کو "آستانۂ عالیہ قادریہ" کی بلڈنگ دکھے گی: جہاں حضرت صاحبِ سجّادہ کی نشست گاہ ہے۔ مسجد، خانقاہ اور مدرسے کا یہ سنگم

دیکھ، میں علامہ جامی کا ایک شعر گنگنا رہا ہوں، آپ بھی سن لیں:

خوشا مجلس و منبر و خانقاہے

کہ در وے بود قیلِ و قالِ محمّد

آئیں، پہلے آپ کو مسجد اور متعلقہ مقامات دکھاتا ہوں۔ تو جیسے ہی آپ صدر دروازے سے داخل ہو کر اینٹرنس پیسج کو عبور کرنے کے بعد، اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ کر وضو خانے کی طرف آئیں گے، تو آپ کو سب سے پہلے یہ موٹر والا کمرہ نظر آئے گا: جس سے بالکل سٹ کے وضو خانہ ہے اور اس کے آگے کی طرف چھوٹی سی دیوار ہے، جس میں ٹنکیاں لگی ہیں۔ وضو خانہ کی دیوار کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے، آپ اینٹرنس پیسج میں آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھ سکتے ہیں اور گپّے بھی مار سکتے ہیں۔ بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے لئے وضو خانے پر ٹین کا شَیڈ پڑا ہوا: جس سے بارش سے تو بچا جا سکتا ہے البتّہ دھوپ تو رخ بدل کر تپانے کا ہنر جانتی ہے۔ وضو خانے کے مغربی حصّے میں یہ جو بڑا اور لمبا سا کمرہ نظر آ رہا ہے، یہاں شعبۂ حفظ کے طلبہ رہتے ہیں۔ اب چلیں مسجد کے یہ جو تین بنا دروازے والے دَر دکھ رہے ہیں، اِن سے اندر چلتے ہیں۔ ارے آپ ٹھٹھک کیوں گئے؟ ابھی گرمی کا موسم ہے اِس لئے یہ در و بام بے پردہ نظر آ رہے ہیں، سردی کی آمد ہوتے ہی، اِن پر چِک ڈال کر باحجاب کر دیا جائے گا۔

یہ دیکھیں، آئیں یہ مسجد کا درمیانی حصّہ ہے اور جب آپ اندرونی حصّے کو دیکھیں گے، تو سمجھے گا کہ یہ بھی اندرونی حصّے ہی کی طرح ہے بس تھوڑا کشادہ ہے؛ قبلے کی سمت واقع دیوار پر دونوں طرف الماریاں بنی ہوئی ہیں: جس میں حفظ کے طلبہ اپنے حافظی قرآن رکھتے ہیں اور الماری کے دائیں بائیں خالی جگہ پر یہ طغرے دیکھے جا سکتے ہیں۔

تو یہ ہے؛ مسجد کا اندرونی حصّہ، سامنے کی طرف محراب ہے، اُس کے دائیں جانب منبر، منبر پر یہ عصا دیکھ رہے ہیں، اِس کو پکڑ کر حضرت اقدس جمعے کا خطبہ دیتے ہیں۔ اِس طرف دیکھیں، جی، منبر سے تھوڑے فاصلے پر، ہاں اِسی طرف، یہ دیوار ہی میں ایک الماری بنی ہوئی ہے: جس میں قرآن شریف اور اوراد و وظائف کی کتابیں رکھی جاتی ہیں۔

اچھّا! محراب کی بائیں جانب بھی منبر ہی کی طرح خالی جگہ ہے۔ بس منبر کی بنسبت تھوڑی زیادہ ہے: جس کی اوپر کی سیڑھی پر درمیانی قد کی ایک الماری میں قرآن مجید کے پارے رکھے رہتے ہیں۔ اُس کے نیچے والی سیڑھی پر

جو ایک خوبصورت لکڑی کی شو کیس نما پیٹی نظر آرہی ہوگی، اس میں بھی قرآن مجید رکھا ہے۔ بائیں جانب کی طرح یہاں بھی دیوار میں الماری ہے۔ لیکن دائیں جانب کے مقابلے یہ کافی بڑی اور کشادہ ہے۔ اِس میں مسجد کا فلور فرش رکھا جاتا ہے۔ دروازہ کھول کر دیکھیں، کتنی بڑی ہے۔ ویسے یہ جو دائیں اور بائیں طرف دو دروازے نظر آرہے ہیں، اِن کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا؟ اوہ ہاں ! بتانا بھول گیا تھا، اچھّا ہو آپ نے پوچھ لیا۔ یہ جو سیدھے ہاتھ کی طرف والا دروازہ ہے، یہ شعبۂ حفظ کے طلبہ کی قیام گاہ میں کھُلتا ہے اور بائیں طرف والا، آستانے کے اندرونی کمرے میں۔ اوپر دیکھیں، یہاں سیلنگ پر پنکھوں کے ساتھ کچھ قمقمے بھی لگے ہوئے ہیں۔ درمیانی اور اندرونی دونوں حصّوں میں دو دو صفیں بنتی ہیں اور باقی صفیں باہر کھلی جگہ اور آستانے میں۔

نشست گاہِ حضور صاحبِ سجادہ:

اِدھر بائیں طرف آجائیں، آستانہ بھی دیکھ لیں، پھر آگے چلتے ہیں، یہ ہے آستانے کا باہری حصّہ، گرمی کے موسم میں حضرت صاحب سجّادہ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ جی، یہ جو باہر کا جنوبی حصّہ ہے، یہاں آپ کے لئے چٹائی بچھا کر ایک عدد گاؤ تکیہ لگایا جاتا ہے۔ آپ کے بائیں طرف ٹیلیفون رکھا رہتا ہے، جس پر اہل ارادت فون کر کے اپنے حال احوال اور دعاؤں کے لئے عرض گذاشت پیش کرتے ہیں۔

یہ خوبصورت گہرے بھورے رنگ کے دروازے آستانے کے اندر کھولتے ہیں۔ اِن پر لگے یہ پیتل کے خوبصورت ہینڈلز اور برو چِس دور سے دیکھنے پر سونے کے معلوم ہوتے ہیں۔ اندر داخل ہونے کے بعد، بالکل سامنے کی طرف جو دروازہ دکھ رہا ہے، وہ اندرونی کمرے کی طرف لے جاتا ہے؛ جہاں باہر سے آئے دیگر خانقاہی سجّادگان کے قیام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اندر کے کمرے میں شمال کی طرف، آپ کو وہی مسجد والا دروازہ نظر آئے گا اور دروازے کے بغل میں دائیں بائیں دو الماری؛ جن میں خانقاہ کے شجرے اور دیگر اہم سامان رکھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اندر ایک اسٹور روم بھی ہے: جس میں آستانے میں بچھائی جانے والی قالین وغیرہ رکھی ملیں گی نیز اس اسٹور روم کے بالکل برابر ایک واش بیسن اور اُس کے برابر اٹیچ باتھ روم بھی ہے۔

آستانے کے مین ہال میں سیدھی طرف بالکل سینٹر میں، حضور غوث اعظمؒ کی گنبد کی فریم کی ہوئی تصویر لگی ہے اور اُس کے بالکل نیچے صوفے کے گدّے کی طرح مہرون کلر کی نشست ہے۔ جس کے گرد گول سفید رنگ کی ٹیبل

نصب ہے؛ یہ حضور صاحب سجّادہ کی مخصوص نشست ہے : جہاں آپ سردیوں میں روز اور گرمیوں میں جمعے کے دن تشریف رکھتے ہیں۔ حضور صاحب سجّادہ کی نشست کے مشرقی اور مغربی سمت میں کچھ ریکس بنی ہوئی ہیں : جن پر ہلکے سبز رنگ کے گلدان رکھے ہیں اور برابر میں اندرونی کمرے کی طرح، دیوار ہی میں دو الماریاں ہیں۔ ہال کے وسط میں ایک خوبصورت بلبوں سے مرصّع پنکھا لگا ہوا ہے جو ہوا کے کم اور زیب وآرائش کے زیادہ کام آتا ہے۔ ویسے دیواروں پر لگے خوبصورت فانوس بھی دیکھنے لائق ہیں۔ ہال کی جنوبی دیوار پر حضور صاحب سجّادہ، تاجدارِ اہلسنّت کا درج ذیل شعر بھی دیکھا جاسکتا ہے :

میری قسمت دیکھئے کتنی بڑی نسبت ملی

قادری ہوں، قادری ہوں، قادری ہوں قادری

ہال کے جنوبی حصّے میں ایک دروازہ اور بھی ہے : جو پیچھے چبوترے کی طرف کُھلتا ہے۔ عموماً آستانے کا مین دروازہ اندر سے بند کرکے، اسی عقبی دروازے پر تالا لگایا جاتا ہے۔

چبوترے سے درسگاہ تک :

تو صاحب، اب ہم جنوب کی جانب اپنا قبلہ کرکے آستانے کے مین گیٹ کے سامنے کھڑے ہیں؛ جہاں سے مدرسے کے وسط میں موجود "کامنی کا پیڑ"، مشرق میں "ہال کمرہ"، "گوش محل"، سامنے چبوترے پر موجود درسگاہیں، تمام اوپر نیچے جانے والے زینے اور کمرے سب کچھ نظر آتا ہے اور پورے مدرسے کا گشت لگانے کی تمام راہیں ہموار ملتی ہیں۔ اب یہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں کہ آپ کو پہلے کیا دیکھنا ہے؟ اچھّا! کمرے ؟ چلیں، پھر پہلے چبوترے پر چلتے ہیں، وہاں کی درسگاہ دیکھتے ہیں، پھر زینے سے اوپر چلیں گے۔

کامنی کا درخت مدرسے کے بیچ و بیچ واقع ہے اور اس کے دونوں طرف چبوترے پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ چبوترے پر کل ملاکر ۱۲ کمرے بنے ہوئے ہیں؛ تین دائیں طرف، تین بائیں طرف اور چار بالکل سامنے؛ جس میں سے ایک کمرہ تھوڑا مشرق کی جانب اوپر جانے والے زینے سے سٹا ہوا ہے۔ اِن کمروں میں سے کچھ پرائمری کلاس کے ہیں اور کچھ حفظ اور درس نظامی کے لئے اور بقیہ دو کمرے وہ کونے میں جو ایک در نظر آرہا ہے، اُس میں ہیں؛ در میں داخل ہوتے ہی بالکل سامنے والا کمرہ؛ مدرسے کے کلرک ماسٹر پرویز صاحب کا آفس ہے

اور بائیں طرف والا کمرہ درسی کتابوں کے کتب خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے؛ جہاں سے طلبہ کو کتابیں جاری کی جاتی ہیں۔

چلیں! اب اِس مشرقی زینے سے اوپر چل کر طلبہ کے رہائشی کمرے دکھاتا ہوں۔ لو صاحب آگئے اوپر، نیچے ۱۲ کمرے تھے اور اوپر کل ۱۰ کمرے ہیں، ایک تو یہ جس کے سامنے ہم کھڑے ہیں؛ زینے سے بالکل سٹا ہوا، چار وہ بیچ سے دائیں طرف اور تین بائیں طرف، اور دو یہ بالکل بیچ والے۔ اچھّا! یہ جو یہاں زینے کے بالکل سامنے، مغربی سمت والا کمرہ ہے؛ یہ تاج الفحول اکیڈمی کی مطبوعات کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

یہاں بیچ میں آیئے، یہاں سے آپ کو آستانے کی چھت، لائبریری وغیرہ دکھاتا ہوں۔ وہ دیکھیں، وہ جو کامنی کے دائیں طرف والی سیڑھیوں کے بغل سے جو زینہ آرہا ہے، جب آپ اُس سے اوپر آنے کے بعد، اپنے اُلٹے ہاتھ کی طرف مڑیں گے تو سامنے ہی آستانے کی چھت دکھے گی اور اگر مڑنے کی بجائے، دیوار کے پاس کھڑے ہو گئے، تو سامنے کامنی کے اُس پار کی گیلری، "کتب خانہ قادری" اور اُسی لائن میں دوسرے کمرے نظر آئیں گے۔ آپ کو کتب خانے والی گیلری سے جانا ہے؟ چلیں! سنبھال کر، نیچے سیڑھیاں ہیں۔ یہاں اس گیلری میں لائن سے ٹوٹل تین کمرے اور ایک لائبریری ہے؛ ایک کمرہ تو سیڑھیوں سے اُترتے ہی ہے، اُس کے برابر کتب خانہ اور پھر لائن سے دو کمرے۔ آگے راؤنڈ شیپ موڑ ہے اور موڑ کے بالکل سامنے مدرسے کی چھت پر جانے کا زینہ۔ سیدھے ہاتھ کی طرف بالکل بیچ میں جال ہے اور اُس کے اطراف میں چار کمرے ہیں۔ ایک مشرقی، دوسرا مغربی اور بقیہ دو جنوب میں ہیں۔ شمال کی طرف یہ زینہ ہے، جس سے ہم نیچے اُتر رہے ہیں۔ اِس جگہ کو "گوش محل" کہتے ہیں اور اس کے بالکل سامنے سنٹرل ہال ہے۔ اب ذرا سیدھے ہاتھ کو مڑیں، یہ لو پھر سے ہم آستانے کے سامنے آگئے۔

ارے! آپ کو بیک سائڈ والا بھاٹک تو دکھایا ہی نہیں۔ وہ دیکھیں، یہ کامنی کی سیدھی طرف جو بڑا سا گیٹ دکھ رہا ہے، یہ باہر سڑک پر کھلتا ہے؛ عام طور پر یہ گیٹ بند ہی رہتا ہے اور صرف ضرورت پڑنے پر ہی کھولا جاتا ہے۔

اب ذرا، میں اپنی اٹیچی کمرے میں رکھ دوں۔ پھر کتابیں لینے چلتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو اپنی جماعت (اعدادیہ) کے ساتھیوں سے بھی ملواتا ہوں۔

زرد دفتر اور حنا کی کتابیں:

"نذیر، بیٹا! یہ اعدادیہ والوں کو کتابیں نکال کر دو۔" یہ آواز، جو ابھی آپ نے سنی —— نرمی اور کرختگی کے درمیانی لہجے میں —— ہمارے "حضور " کی ہے۔

حضور؟ یہ کیسا نام ہوا؟ ارے میاں، یہ نام نہیں، لقب ہے۔ اصل نام ہے **مولانا نبی رضا صاحب۔** لیکن مدرسے کے ہر گوشے میں، طلبہ سے لے کر اساتذہ اور عملے تک، سب انہیں "حضور" ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔

اونچا قد، کشادہ پیشانی، لمبا چہرہ، ہلکا سا دبتا مگر کھلتا رنگ، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، اور چلتے وقت بایاں کندھا ہلکا سا جھکا لینا —— یہ سب آپ کی شخصیت کو نمایاں اور منفرد بناتے ہیں۔

مدرسے میں درسی کتابوں کی خریداری ہو، جلد بندی کا مرحلہ، یا تعلیمی سال کا آغاز و اختتام —— کتابوں کی ترسیل سے لے کر ان کی واپسی تک کے تمام انتظامی امور انہی کے سپرد ہوتے ہیں۔

ایک، دو، تین اور یہ رہی چوتھی کتاب انوار شریعت۔

۱. منہاج العربیہ
۲. فارسی کی پہلی
۳. تسہیل المصادر
۴. انوار شریعت

یہ چاروں کتابیں میرے نام پر جاری کر دی گئی ہیں۔ کل سے ان شاءاللہ درس کا آغاز ہو گا۔

رفاقتوں کا پہلا چراغاں:

آج درس کا پہلا دن ہے۔ یہ جو تپائیوں کے ارد گرد حلقہ بنائے ۲۵ کے قریب لڑکے دِکھ رہے ہیں، یہ سب میرے ہم جماعت ہیں۔ مجھ سے تو آپ صدر دروازے پر مل چکے ہیں، اِس لئے اب دوسروں سے ملاقات کراتا ہوں۔ اُدھر دیکھیں، وہ سامنے والی تپائی پر، ہاں وہیں، بالکل میرے ہاتھ کی سمت میں۔ جی، تو وہ جو پستہ قد سبز کُرتے میں ملبوس، اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے والے حضرتِ والا کو دیکھ رہے ہیں؛ یہ نواب عالم ہے۔ اُس کے برابر میں، ہلکے زریں رنگ کا کرتہ زیب تن کئے، جو عظیم

ہستی جلوہ افروز ہے، وہ زاہد خورد صاحب ہیں۔ اب یہ زاہد خورد میں، خورد کا کیا کردار ہے؟ اس کو جاننے کے لئے آگے کی سطریں ملاحظہ کریں۔ بیچ والی تپائی پر جو قدرے دراز قد والا لڑکا ہے، وہ نظر العابدین اور اُس کے بالکل برابر بھولی سی صورت والے ماجد بھائی ہیں۔ دوسری لائن میں دائیں سے پہلا، جو لمبے چہرے والا لڑکا نظر آرہا ہے، وہ ہمارے حضور کا برادرِ خورد، زاہد ہے۔ اب چونکہ اِن کے نام کے آگے حضور نے ایک جماعت میں دو ہمناموں کے کنفیوژن سے بچنے کے لئے "کلاں" کا اضافہ کر دیا ہے، اس لئے پہلے والے زاہد کے نام کے آگے "خورد" کا لاحقہ اپنے آپ ہو گیا، مطلبکہ؛ بائے وَن، گیٹ وَن فری۔

آہا! ہوشیار! خبردار! اپنے ہوش و خرد کو حد میں رہنے کا فرمان جاری کر دیں اور شعور و آگہی کو سرحدوں کا پابند بنا دیں، کیونکہ اب جس عظیم شخصیت کا میں تعارف کرانے جا رہا ہوں، اُن کی صوفیت کا ڈنکہ ابھی سے شش جہاتِ مدرسہ میں بابانگ دہل بج رہا ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ وہ تو رب قدیر و مقتدر کا شکر کہ اُس نے صرف شش جہات کی تخلیق فرمائی، اگرچند اور جہتیں بھی ہوتیں، تب بھی ہمارے صوفی صاحب کا اسم گرامی و قار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ وہاں بھی چمک رہا ہوتا۔

اچھا! بھئی ٹھیک ہے، میں آپ کی بیتاب ہوتی دھڑکنوں، تیز ہوتی سانسوں کو مزید بیقرار نہیں کرتا اور آں حضرت اعلی جاہ کا نام آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں، لیکن اُس سے قبل اپنی نظروں کو بہرِ تعظیم جھکا لیں تاکہ نادانستہ طور پر بھی آپ اپنی بیتابئ نگاہ کے سبب کسی گستاخی کے مرتکب نہ ہو جائیں، کیونکہ ہماری جماعت کی مسند تصوف کے مسند نشیں کوئی اور نہیں، بلکہ میرے پہلو میں بیٹھے قبلہ **تسلیم احمد خان صاحب** ہیں۔

ربِّ یسّر کی دہائی:

کھڑے ہو جاؤ، مولانا صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ یہ پہلا گھنٹہ تسہیل المصادر کا ہے، شنید ہے کہ یہ کوئی فارسی کے مصادر کی کتاب ہے: جس میں فارسی زبان کے کثیر الاستعمال مصادر کو جمع کیا گیا اور اب حضرت مولانا مجاہد صاحب ہم لوگوں سے اس کی رٹائی کروائیں گے۔ مولانا صاحب مسند تدریس پر جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ رسمی تعارف و حاضری کے بعد "ربّ یسِّر ولا تعسّر وتمم بالخیر" کا ورد ہو رہا ہے (آپ کیا بیٹھے بیٹھے سن رہے ہیں، میرے ساتھ ورد کریں)۔ ورد ختم ہوا اور اب مولانا صاحب اِس کا ترجمہ بتا رہے ہیں کہ "اے میرے رب، تو اِس

کتاب کو ہمارے لئے آسان بنا اور مشکل نہ بنا اور خیر و عافیت کے ساتھ اِس کو پایۂ تکمیل کو پہونچا"۔ بھائی! جس کتاب کو شروع کرنے سے پہلے آسان ہونے کی دعائیں کی جائیں، وہ کتاب کتنی مشکل ہو گی۔ اللہ مجھے بشمول میرے ساتھیوں کے اِس کتاب کی سختی اور مولانا کی ضرب سے محفوظ فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

مطلب کہ اب اِس گھنٹے میں ہم لوگ بیٹھ کر پہیلیاں سلجھائیں گے ؟ جیسے ہی میں نے سنا کہ اگلا گھنٹہ "فارسی کی پہیلی" کا ہے؛ بے ساختہ میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ اب چونکہ ایک تو کتاب کے نام میں ہی "پہیلی" موجود ہے اور دوسری بات یہ کہ جب سے کتاب ملی ہے، تب سے کئی بار کتاب کو کھول کر، اُلٹ پلٹ کر دیکھ چکا ہوں اور ہر بار اُلٹنے پلٹنے کے بعد ایک ٹھنڈی آہ بھر کر "زبانِ یارِ من فارسی و من فارسی نمی دانم" کہہ کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہوں کیونکہ بقول علامہ اقبال:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

فارسی کی پہیلی ؟ لیکن اس کا نام تو۔۔ بس بس۔ آپ کو بھی حیرانی کا جھٹکا لگ گیا نا؟ ارے بھئی! میں مذاق کر رہا تھا کتاب کا نام "فارسی کی پہیلی" نہیں بلکہ "فارسی کی پہلی" ہے۔ آپ لوگ بھی، لکھنے والو کی، ہر بات مان لیتے ہیں، اب وہ تو میں شریف قسم کا راقم ہوں، اِس لئے بتا دیا ورنہ آپ لوگ آنے والے صفحات میں نا جانے کون کون سی پہیلیاں بجھاتے اور مجھ ناتواں سے حل کرنے کا مطالبہ کرتے۔

خیر! تو صاحب یہ "فارسی کی پہلی" کتاب مولانا نبی رضا صاحب کے پاس ہے، لہٰذا مولانا مجاہد صاحب کے کلاس سے نکل کر سامنے والے کلاس میں چلتے ہیں۔ یہاں بھی کتاب شروع کرنے سے قبل دعا کی گئی۔ اِس کے بعد ہمارا عربی کی کتاب: منہاج العربیہ کا گھنٹہ ہے، جو حضور شیخ صاحب کے پاس ہے۔ وہ جو اوپر بیچ میں دو کمرے دکھ رہے ہیں، اُن میں سے دائیں طرف والا کمرہ، شیخ صاحب کا آفس ہے اور وہیں آپ کلاس لیتے ہیں۔

خِطاب کا نصاب:

ہمارے اساتذہ و دیگر حضرات کے القاب و آداب کے حوالے سے آپ لوگ بڑے کنفیوژ لگ رہے ہیں؟ صحیح بات ہے ؟ چلیں! تو پہلے آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسے میں ہم ذمہ دارانِ مدرسہ اور اپنے اساتذہ کو کس

طرح مخاطب کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں دیگر مدارس کی طرح حضرت، حضور کا رواج نہیں ہے۔ تو پھر کیا آپ لوگ اساتذہ کا؟ بس یہیں رک جائیں۔ میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ آپ یہی پوچھنا چاہ رہے ہیں نا کہ اگر ہمارے یہاں حضرت و حضور کا رواج نہیں ہے تو پھر کیا ہم لوگ اساتذہ کو اُن کے نام سے پکارتے ہیں؟ بالکل نہیں۔

دیکھیں، جب مدرسے کا کوئی طالب علم آپ کو یہ کہتا سنائی دے، "کہ حضرت تشریف لے آئے، حضرت آج فلاں جگہ تشریف لے گئے ہیں"، تو اُس سے طالب علم کی مراد کوئی استاذ نہیں بلکہ صرف اور صرف مدرسہ عالیہ قادریہ کے سرپرستِ اعلی، حضور صاحب سجّادہ، تاجدار اہل سنت حضرت علامہ عبدالحمید محمّد سالم القادری برکاتہم العالیہ کی ذات ہو گی۔

اِسی طرح استاذ محترم شہزادۂ حضور تاجدار اہل سنت، حضرت علامہ اسید الحق محمد عاصم القادری - مدظلہ العالی - کو ہم سب لوگ "شیخ صاحب" کہتے ہیں اور آپ کے برادر صغیر حضرت مولانا عطیف قادری صاحب - مدظلہ العالی - کو آپ کے تخلص کی نسبت سے "عشقی صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اِسی طرح حضور صاحبِ سجادہ کے سب سے چھوٹے شہزادے، حضرت مولانا فضل رسول محمد عزام میاں القادری صاحب -زید مجدہ- جو کہ ہمارے سینئر بھی ہیں، سارے اساتذہ و طلبہ "میاں" کہتے ہیں۔

اب آتے ہیں اساتذہ کی طرف، عموماً ہم لوگ اپنے سارے درسِ نظامی کے اساتذہ کو انفرادی طور پر صرف "مولانا صاحب" کہتے ہیں، لیکن اگر کسی استاذ نے دوسرے استاذ کے لئے کچھ بھیجا ہو یا لاٹھی سے ہماری عزت و توقیر میں چار چاند لگانے کی غرض کے پیشِ نظر، دوسری درسگاہ سے حضرت بیت کو منگوانا ہو تو اُس وقت ہم لوگ "مولانا صاحب" کے "اسمِ محذوفِ منوی" کا اظہار کر کے "مولانا فلاں صاحب" کہتے ہیں۔ ہاں اگر بھیجنے والے یا منگوانے والے مولانا صاحب، مولانا نبی رضا صاحب ہوں، تو پھر اُن پر استثناء متصل کا قاعدہ لاگو کرتے ہوئے کہا جاتا ہے۔ "کہ "حضور" نے یہ بھیجا ہے یا "حضور" نے لاٹھی منگائی ہے"، کیونکہ پورا مدرسہ بشمول اساتذہ آپ کو "حضور" کہتا ہے۔ میرے خیال میں، اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم اپنے اساتذہ کو کیسے مخاطب کرتے ہیں؟ اب اگر درج بالا تفصیل کے بعد بھی آپ کچھ نہیں سمجھے، تو پھر اوّل و آخر تین تین بار درود شریف پڑھ کر اوپر کی سطریں دہرائیں۔ انشاءاللہ سمجھ جائیں گے۔ **وماعلینا الا البلاغ۔**

انوارِ شریعت اور اُردو املاء مولانا اقبال صاحب کے پاس ہے۔ میں نے آپ سے پرائمری میں بھی پڑھا ہے، اِس لئے سب لوگ تو مولانا صاحب کہتے ہیں لیکن میں ابھی بھی ماسٹر صاحب کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہوں۔ انگلش ماسٹر تنویر صاحب کے پاس ہے۔

دور افتادہ منزلوں کے قریبی چراغ:

اچھا، یہ بھی ایک الگ مرحلہ ہے۔ اب تک پرائمری اسکول کی حد تک تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا، لیکن جیسے ہی براہِ راست مدرسے کی تعلیم کی طرف قدم بڑھایا— وہ بھی بدایوں میں رہتے ہوئے— تو گھر کے ہوتے ہوئے بھی ہاسٹل ہی کو اپنا مسکن بنانا پڑا۔ اور سچ کہوں تو، ہاسٹل کی زندگی وہ خاموش انقلاب ہے جو آپ کے رویے، عادتوں، اور سوچ کے زاویے یکسر بدل دیتا ہے۔

وہ بچے، جو گھر میں ایک گلاس پانی بھی خود سے نہیں لیتے، یہاں ہر کام خود سیکھنے لگتے ہیں؛ نہ صرف خود سیکھتے ہیں، بلکہ ایک غیر محسوس خود مختاری کا ذائقہ چکھنے لگتے ہیں۔

دنیا کو دیکھنے کا زاویہ بدلنے لگتا ہے— مثلاً، پہلے چھٹی کا مطلب ہوتا تھا کہیں گھر سے باہر جانا، اب چھٹی کا مطلب ہوتا ہے (وقتی طور پر ہی سہی) گھر واپس جانا!

اب تک زندگی میں یا تو گھر والے شامل تھے یا دوست احباب، لیکن اب زندگی ایک تیسری قسم کے رشتوں سے متعارف ہو رہی ہے— وہ چہرے جو کل تک اجنبی تھے، آج گھر والوں کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں۔

شرارت ہو یا سنجیدگی، ہنسی مذاق ہو یا دل کی اداسی— ہر احساس، ہر لمحہ بانٹنے کے لیے جو ہاتھ بڑھتے ہیں، وہ انہی روم میٹس کے ہوتے ہیں۔ اور شاید ہاسٹل زندگی کی یہی سب سے بڑی خوبصورتی ہے— یہاں جو رشتے بنتے ہیں، وہ اکثر تادمِ حیات ساتھ نبھاتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اِن لمحات کی روشنی، اِن چہروں کی قربت اور اِن رفاقتوں کی حرارت وقت کے شبستان میں کب تک چراغ جلائے رکھتی ہے— کیونکہ:

رات تو وقت کی پابند ہے ڈھل جائے گی

دیکھنا یہ ہے چراغوں کا سفر کتنا ہے

یہ بات ہے تو چلو، بات کر کے دیکھتے ہیں:

ماہرینِ نفسیات کی مانیں تو، جبلّتِ بقا(Survival Instinct) کی روشنی میں انسان فطری طور پر صرف دو ہی چیزوں سے ڈرتا ہے: ایک نیچے گرنے کا اندیشہ، اور دوسرا اچانک آنے والی تیز آوازیں۔

ان کے سوا، جتنے بھی خوف ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑتے ہیں، وہ سب ہماری یادداشت، ماحول اور تجربات کی پیداوار ہوتے ہیں — سیکھے ہوئے ڈر، جو وقت اور حالات نے ہمیں سکھائے، اور جن کی جڑیں ہمارے مشاہدات یا زخم خوردہ یادوں میں پیوست ہوتی ہیں۔

انہی سیکھے گئے خوفوں میں ایک خوفِ سماج بھی ہے — جو ہمیں مراتب اور حیثیت کے مطابق چلنے کا حکم دیتا ہے، اور جس کی گرفت ہمیں ہر قدم پر اپنے دائرے سے باہر نکلنے سے روکتی ہے۔

لیکن لاابالی پن اور الہڑ پن کی خوبی یہی ہے کہ یہ ایک طرف ہمیں معاملاتی قیود و بند سے آزادی بخشتا ہے، اور دوسری طرف ہمیں عاقبت اندیشی جیسے بھاری تصورات سے بھی بے نیاز رکھتا ہے۔

ایسے ہی ایک دن، جب نہ کوئی خاص امید دل میں تھی، نہ کسی اندیشے کا سایہ ذہن پر، زندگی نے ایک ایسے تعلق کی بنیاد رکھ دی جو میرے لیے آنے والے سالوں میں صداقت، اپنائیت اور رفاقت کا استعارہ بننے والا تھا۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ مدرسے کے صدر دروازے پر ایک سفید کلر کی ماروتی اسٹیم کار آکر رکی۔ گاڑی میں سوار مہمان حضرات اترے اور حضرت اقدس کے گھر کے اندر تشریف لے گئے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرے ذہن میں اس وقت بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس گاڑی سے اترنے والوں میں سے ایک چہرہ میری زندگی میں اس درجہ رچ بس جائے گا کہ برسوں بعد بھی اُس کی پہلی جھلک میری یادداشت کے کیمرے میں دھندلے نہیں، روشن عکس کی طرح محفوظ ہوگی۔

جمعرات کی دوپہر تھی۔ چبوترے پر لڑکے کھیل رہے تھے۔ میں سیڑھیوں پر کھڑا آستانہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک کامنی کے نیچے ایک نیا، مگر مانوس سا چہرہ نظر آیا۔ کانوں میں کسی کی آواز پڑی: "یہ سردار بھائی کے بھتیجے ہیں۔"

میرے لئے یہ نام بالکل نیا تھا، اس لئے کچھ سمجھ نہیں پایا۔ پھر سنا: "محمد میاں ہیں، شیخ صاحب کے خالہ زاد۔ کٹرا شریف سے یہاں پڑھنے آئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی دل میں ایک آہستہ سی چمک جاگی۔ خود سے کہا:

"یہ بات ہے۔۔۔ تو چلو، بات کر کے دیکھتے ہیں!"

ظاہر ہے، ابھی ان کا داخلہ ہوا تھا، تو یہی ممکن تھا کہ اعدادیہ میں ہی شامل کئے جائیں۔ تو بہتر یہی لگا کہ ابتدائی گفت و شنید کا سلسلہ ابھی سے شروع کر لیا جائے۔

یہ میرا سید عادل کلیمی صاحب عرف محمد میاں سے پہلا تعارف تھا۔ وہی لمحہ جہاں سے ہماری دوستی نے، اگر یہ طبیعتِ ناتواں پر بارِ گراں نہ گزرے، پہلی سانس لی۔

وقت کے ساتھ یہ دوستی نہ صرف گہری ہوئی، بلکہ مضبوط بھی ہو گئی۔ گو کہ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، مگر یہ سید صاحب کا ہی بڑکپن، انکساری اور محبت ہے کہ میں آج بلا جھجھک ان کو اپنا دوست کہہ پا رہا ہوں۔

مٹی میں چمک ڈال دینا شاید اسی عالمِ پاک کی خُو تھی—اور وہ رفاقت جو نہ دھوم سے آئی، نہ شور سے گئی، بس یاد کی نرم روشنی میں کہیں ہمیشہ چمکتی رہے گی۔

الفتِ فارسی اور ہیبتِ مولانا:

الٰہی خیر گردانی! آج تسہیل المصادر کا سبق یاد نہیں ہے، اِس لئے صبح ہی سے آیت الکرسی کا ورد جاری ہے۔ سنانے کا اگلا نمبر میرا ہے۔ مولانا مجاہد صاحب نے پڑھنے کا اشارہ کیا۔ جتنا یاد آرہا ہے سنا رہا ہوں؛ باریدن: مصدر برسنا/برسانا، بارد: برستا ہے فعل مضارع، ببار: برسا تو فعل امر، ببب بارر۔۔۔ بھول گیا۔ آگے مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میری کشتی "ببب بارر" کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی کہ اچانک پیٹھ پر ایک زوردار مکا پڑا اور "پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"۔

کُٹتے کٹاتے، فیلڈ میں مرغہ بننے کی اعلیٰ ترین مشق کرنے کے ساتھ ساتھ، حضور کے دستہائے اقدس سے ایسی ایسی جگہ لاٹھی کھاتے ہوئے کہ جہاں کا حشر نہ خود دیکھ سکیں اور نہ کسی کو دکھا سکیں، کب سال بیت گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ سالانہ امتحان کے نتائج نوٹس بورڈ پر آویزاں ہیں۔ ہماری جماعت یعنی اعدادیہ میں، نواب عالم نے پہلی

پوزیشن حاصل کی ہے۔

جو بچ گئے، وہی آزمائے گئے:

دوسرے سال کی آمد اور جماعتِ اولٰی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک، ہماری جماعت کے ۲۵ جانباز سپاہیوں میں سے اکثر لاٹھی اور مکّوں کی تاب نہ لاتے ہوئے، پسپائی کی راہ اختیار کر نَو دَو گیارہ ہو گئے تھے اور جو بچ گئے تھے تو وہ زبانِ حال و قال سے مفتی لطف بدایونی کا یہ شعر گنگنانے میں مصروف تھے:

ہوئے جو خاک اِس در پر انہیں نے آبرو پائی
جو بیٹھے نقشِ پا بن کر وہی ثابت قدم نکلے

اب اِن رجز خوانوں کو مفتی صاحب کے شعر سے کتنی ثابت قدمی ملی یا آئندہ ملے گی، یہ تو مجھے نہیں معلوم البتّہ اِن کو یوں گنگنا تا دیکھ مجھے حضرتِ میر یاد آگئے، وہ انہوں نے کبھی کہا تھا:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

تعلیم و تعلّم کے معرکہ میں اب تک ہمارا سابقہ جن سے پڑا تھا، ہم تو انہیں سپاہ سالارِ لشکر سمجھ رہے تھے، لیکن میاں، وہ تو بس پیادے تھے، پیادے، کھیل کے اصل پتّے تو اب کھلنا شروع ہوئے ہیں۔ ہم اہلِ صفاو مردودِ حرم تو تسہیل المصادر سے ڈرے سہمے رہتے تھے اور اِس بار تو فارسی کی تین تین میزائل داغی گئی ہیں؛ ایک تو شیخ سعدی کی گُلستاں، دوسری میزان الصرف اور تیسری نحو میر۔ اِن تین کے علاوہ؛ نور الایضاح، القرآۃ الراشدہ کے شانے سے شانہ ملا کر چلنے کے لئے نیز ذہنی ورزش کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش کا خیال رکھتے ہوئے "جواہر المنطق" کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ تو بھائی جان:

قسطوں میں خود کشی کا مزہ ہم سے پوچھیئے

ایک تو مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کس عقلمند نے کہا تھا: "زبانِ فارسی خیلے دشوار است لکن شیریں است"۔ ہمارا یہاں پِٹ پِٹ کر مزاج کڑوا ہوتا جارہا ہے لیکن اس زبان کی مٹھاس نصیب نہیں ہو رہی ہے۔ اوپر سے تین تین فارسی کی کتابیں ہیں۔ کس سے کس سے بچو۔ میزان یاد کر لو تو نحو میر پٹوا دیتی ہے۔ نحو میر کا سبق یاد ہو جاتا ہے تو شیخ

سعدی کی گلستاں مکے پڑنے کی وجہ بن جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی دنیا کی نظر میں زبانِ فارسی شیریں است۔ ارے بھئی ہمیں نہیں چاہیئے اتنی میٹھی زبان۔ ہمارے لئے اردو ہی ٹھیک ہیں۔ پر ایک منٹ، آج کل تو اردو بھی کہاں ہماری صحت کے لئے مفید ہے۔ کیسے ؟ ارے صاحب، جواہر المنطق جو زندگی میں آگئی ہے۔

میاں! کہاں کا محمود اور کون ایاز؟ مساوات کا اصل کام تو منطق کی کلی، جزئی، عموم خصوص مطلق اور من وجہ جیسی نسبتوں نے کیا ہے۔ بس ذرا آنکھ کھول کر دیکھیں، تو آپ کو نظر آئے گا کہ محمود و ایاز نے تو صرف آدمیت کی حد تک ہی مساوات کی مثال قائم کی تھی لیکن علمِ منطق کی ان اصطلاحات کی رٹائی نے تو، حیوان ساہل اور حیوان ناطق کے درمیان کا فرق بھی ختم کر دیا۔ کتنا ہی مضبوط سبق یاد کر لو، مجال ہے جو صبح تک یاد رہ جائے۔ نتیجہ، جیسے حیوان ساہل کے چابک پڑھتا ہے، اسی طرح اس اشرف المخلوقات حیوان ناطق کے لاٹھی پڑتی ہے۔ اور صرف لاٹھی ہی نہیں بلکہ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں، جن پر کلی جزئی کے ان قضیوں کا انطباق ہوتا ہے جو آج تک نہ کسی منطقی نے سنا ہو گا اور نہ دیکھا ہو گا۔ آپ ہی مجھے بتائیں: کچھ انسان مرغہ کھاتے ہیں۔ یہ ایک جزئیہ موجبہ ہو گیا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ انسان مرغہ بنتے ہیں۔ اس کو آپ کونسا جزئیہ کہیں گے؟ جزئیہ موجبہ یا جزئیہ سالبہ؟ یا کچھ اور؟ جواہر المنطق نے ہمیں وہی نا معلوم جزئیہ بنا رکھا ہے۔ بہر حال دوٹوک بات یہ ہے کہ فی الحال ساری زبانیں ہی جسمانی صحت کے لئے نقصان دہ ہیں۔

اچھا! اتنا تو بتا دو کہ یہ سال اچھا کٹ رہا ہے یا نہیں؟ زخموں پر نمک نہ چھیڑ کو! کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتا ہوں، لیکن موڈ نہیں ہے۔ اس لئے میں کہوں گا کم، لیکن تمہیں سمجھنا زیادہ ہے۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، بس اتنا سمجھ لو کہ زندگی صَرف کبیر و صغیر کے بحرِ صِیَغ میں ڈوبتے ابھرتے، گلستاں سے گل و خار چنتے اور کلی و جزئی سے دست و گریباں ہوتے ہوئے، جیسے تیسے ششماہی امتحان تک پہنچی ہے۔ اس لئے اب جا رہا ہوں تیاری کرنے۔ اللہ حافظ۔

امتحان کا کیا نتیجہ آیا؟ کیوں بتاؤں؟ آپ کی نظر لگ گئی تو؟ اور ویسے بھی بڑے سیانے کہہ گئے ہیں کہ، "یہ باتیں بتائی نہیں جاتیں، نظر لگ جاتی ہے"۔ لیکن پھر بھی پاسِ ادب میں اتنا بتا دیتا ہوں کہ اس بار بھی اول نواب عالم ہی آیا ہے۔

ششماہی امتحان کے نتائج کے اعلان کے بعد، ہم سب اسیروں کو ایک ہفتے کے پَرول پر رہا کیا گیا تھا اور اب مدّت

پوری کر کے ہم اسیرانِ زلفِ لیلائے علم و حکمت:

لوٹ کر پھر اُسی زندانِ کُہن تک پہونچے

ششماہی آخر میں کچھ کتابیں بدل گئی ہیں؛ مثلاً "میزان الصرف" کی جگہ "پنج گنج" نے لے لی ہے اور "القرآۃ الراشدہ" کا دوسرا حصّہ شامل ہو گیا ہے۔ جس کی اِدھر اُدھر سے تھوڑی بہت ورق گردانی کرنے کے بعد ہم بزعمِ خویش خود کلامی کرتے ہوئے گویا ہیں کہ بظاہر تو کتاب کا نام، کَوَر پیج، جلد اور اسباق نئے معلوم ہو رہے ہیں لیکن:

وہی فراق کی باتیں وہی حکایتِ وصل
نئی کتاب کا ایک اک ورق پرانا ہے[۱]

خواہش تو یہ تھی کہ کسی طرح نحو میر سے ہماری جان چھوٹ جائے، لیکن وہ کسی نے کہا ہے نا:

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا

تو جب کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا ہے تو ہم میں کونسے سرخاب کے پر لگیں ہیں، جو ہماری مراد پوری ہوتی اور نحو میر سے پیچھا چھوٹتا۔

مستثنٰی کی لاٹھی اور معشوق کی جھیل آنکھیں:

"رنگ اُجلا مگر گلاب سی سرخی لئے ہوئے جیسے دودھ میں گلاب کی پتّیاں ڈال دینے سے گلابی نمودار ہو جائے، ہونٹوں کے خوبصورت دریچوں سے جھانکتا ہوا ایک حسین تِل گویا دولتِ حسن پر دربان بٹھار کھا ہو۔ سنگِ مرمر سی سفید شفّاف پیشانی اور اُس کے کچھ فاصلے پر واقع دو جھیل، جنہیں گنوار لوگ آنکھیں کہتے ہیں۔"[۲]

"احمد! یہ کیا بولے جا رہا ہے؟ یہ پنج گنج ہے تیری معشوقہ نہیں جو اِسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے، یہ سب بک رہا ہے"۔ نواب نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔

ہائے! کم بخت مجھے اُس پری وش کے خیالوں کی حسین وادی سے نکال رہا ہے؟ اب ہم وارفتگانِ شوق کے لئے کیا پنج

---

(۱) اصل شعر درج ذیل ہے:

وہی فراق کی باتیں وہی حکایت وصل
نئی کتاب کا ایک اک ورق پرانا تھا

(۲) یہ پورا جملہ میں نے یا تو کہیں پڑھا تھا یا سنا تھا۔ البتہ، کہاں، یہ فی الحال یاد نہیں آرہا ہے۔

گنج اور کیا نحو میر:

بھلا دیں ہم نے کتابیں کہ اس پری رو کے
کتابی چہرے کے آگے کتاب ہے کیا چیز

ابھی حضور آرہے ہیں، بَیت لے کر، وہ بھُلوائیں گے تمہیں کتابیں، وہ بھی اچھّے سے۔ آج مستثنٰی کا مکمل اعراب سنانا ہے۔ یاد ہے کہ پری وش نے بھُلادیا؟ بھائی! یہ سن کر تو میرے طوطے اڑ گئے۔ جس کے بعد میرے دماغ سے پری وش کا خیال ایسے ہَوا ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لیکن جب تک وہ سینگ غائب ہوئے، ہمارے اعراب کے حافظے کا نشیمن جل چکا تھا۔ لہٰذا ایک سرد آہ بھری اور خود کو لاٹھی کے لئے تیار کرتے ہوئے، اقبال کی پسندیدہ شانِ شاہینی کا علم بلند کر کے بس اتنا کہا:

نہ پُوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

میرے جلتے نشیمن کی آگ میں، حضور کی لاٹھی نے پھکنی کا کام کیا، نتیجۃً سارا نشیمن جل کر خاکستر ہو گیا: جس کے بعد میں نے نم آنکھوں سے اپنے ہم جماعت ساتھیوں سے انتہائی جذباتی خطاب کرتے ہوئے، رقّت آمیز لہجہ میں کہا:

بخدا! اِس نحو میر نے تو جگر کا خون جلا رکھا ہے۔ "**کانَ**" اور اُس کے بہنیں کیا کم تھیں، جو اب یہ "**مستثنٰی**" بھی آگیا: مزید جلے پر نمک چھڑکنے۔ یہ مستثنٰی متصل ہے، تو اس نے لاڑھی کے ساتھ اتصالِ غیر منفصل کرار کھا ہے۔ منقطع نے دل سے سکون و اطمینان کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔ "**اِلّا**" کا اعراب سنتا ہوں تو "اِلّا اللہ" کی ضربیں لگاتے ہوئے، بے سکونی سے سکون کی راہ کا متلاشی بن کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اب "غَیرَ" کی تو کیا بات کروں: کمبخت نے استاذ و شاگرد کو ایک دوسرے کے لئے غیر بنا دیا ہے۔ لیکن افسوس تو اِس بات کا ہے کہ جس نحو میر کے سبب ہم بدن بریدہ و سپرِ دِلا ٹھی و بَیت ہوئے ہیں، کمبخت اِن زخموں کا مرہم بھی اُسی نحو میر کے پاس ہے، مطلب کہ:

میرؔ کیا سادے ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

فی الحال تو ایسا لگ رہا ہے کہ نحو میر کا ہمارا پیچھا چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن اُمید ہے ایک دن آئے گا جب اس نحو میر سے نجات نصیب ہو گی تب تک جیسے گزاری جاسکتی ہے، گزار لیتے ہیں۔

انجمن اور تنبیہ الغافلین:

اللہ اکبر کبیرا! آپ لوگ کو یہ درسی کتابوں کے قصّے سناتے سناتے، ایک تو میں بذات خود اپنے پورے وجود مسعود کے ساتھ اچّھا خاصا تھک چکا ہوں نیز اُکتاہٹ برآں مستزاد۔ دوسرا مسلسل یہ پڑھنے لکھنے کی باتیں سن سن کر آپ کو بھی شاید ایسا لگ رہا ہو کہ ہمارے مدرسے میں جو مخلوق پابندِ سلاسلِ تعلیم و تعلم ہے، وہ ہمہ وقت بس کتاب کتاب اور کتاب ہی کے پہلو میں بیٹھی رہتی ہے۔ لیکن یہیں آپ چُوک گئے۔ کیونکہ بقول بہادر شاہ ظفر:

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

تو پھر:

آؤ کوئی تفریح کا سامان کیا جائے
پھر سے کسی واعظ کو پریشان کیا جائے

ہفتے بھر کتابوں میں سر کھپانے اور ڈانٹ ڈپٹ کی تمازت برداشت کرنے کے بعد، جیسے ہی جمعرات کی دوپہر اپنے ساتھ جمعے کی چھٹّی کا مژدۂ جاں فزا لے کر آتی ہے۔ تو مدرسے کے ہر طالبِ علم کو بالکل ویسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسا کسی صحراء نشیں کو صحراؤوں میں ہولے سے چلنے والی بادِ نسیم سے فرحت و نشاط کا احساس ہوتا ہے۔

جمعرات کی دوپہر کھانے کے بعد ہم لوگ مدرسے کے وسط میں واقع چبوترے پر کرکٹ کھیلتے ہیں اور جو کرکٹ کا شوق نہیں رکھتے: وہ کھیل والے کمرے میں بیٹھ کر کیرَم، لوڈُو وغیرہ کھیلنے میں مشغول رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کھیلنے کے لئے درگاہ قادری کے پاس واقع "قاضی حوض" بھی چلے جاتے ہیں: کیونکہ وہاں کا میدان خاصا بڑا ہے اور کھیلنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ عصر تک تو یہ سب چلتا ہے۔ پھر عصر کی نماز کے بعد اگر کسی کو مارکیٹ وغیرہ جانا ہو تو وہ مولانا مجاہد صاحب سے اجازت لے کر باہر جا سکتا ہے۔

ویسے غالؔب کہہ گئے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو پھر مدرسے کی جمعرات کا تذکرہ ہو اور انجمن کا ذکر نہ ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ حسبِ معمولِ انجمن، ہفتہ بھر پہلے ہی نوٹس بورڈ پر اُن تمام محتسبین و واعظین مع قاریٔ خوش الحان و بلبلانِ باغِ طیبہ کے اسماء گرامی کی فہرست آویزاں کر دی جاتی ہے، جن کو جمعرات کی شب بعد نمازِ عشاء قاری کریم اللہ صاحب کے درجے[۳] میں منعقد ہونے والی **"انجمن گلشنِ بغداد"** میں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا موقع دیا گیا ہے (جملہ کچھ زیادہ ہی بڑا ہو گیا۔ آپ پانی پی کر آئیں پھر آگے بتاتا ہوں۔)۔ "انجمن" کی لسٹ کے اوپری دائیں اور بائیں طرف دو شعر لکھے ہوتے ہیں، ایک طرف ساؔغر نظامی کے شعر کو قدرے ترمیم کے ساتھ کچھ یوں لکھا جاتا ہے، آپ بھی دیکھیں:

یہ مدرسہ ہے ترا میکدہ نہیں واعظ
یہاں کی خاک سے انساں بنائے جاتے ہیں[۴]

اور دوسرا:

مقصود ہے اِس بزم میں اصلاحِ مفاسد
نشتر جو لگاتا ہے وہ دشمن نہیں ہوتا

اب دوسرے شعر کے تو مضمون ہی سے ظاہر ہے کہ اِس شعر کو لکھنے کا مقصد بزم میں ہونے والی اغلاط کی اصلاح کرنے والے حضرت "مصلح"[۵] کے عملِ اصلاح کو جائز قرار دینا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ویسے ہی جیسے شیخِ حرم واعظ کی جانب سے رندوں کو کی جانے والی نصیحت کو جائز ٹھہراتے ہیں۔ ویسے یہ بات تو زبان زدِ خاص و عام ہے کہ رندوں کو واعظ کی بات نہ کبھی سمجھ آئی ہے اور نہ ہی آئے گی ہاں! اب اگر بقول فرازؔ:

شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجے گا

(۳) ابتدا میں جب ہال کمرہ عرسِ قادری میں استعمال ہونے والے سامان کے لئے بطور اسٹور روم استعمال ہوتا تھا، اُس وقت انجمن کسی بھی ایک درسگاہ میں ہوتی تھی۔ اب چونکہ اس کے لئے کوئی خاص درسگاہ متعین نہیں تھی تو کبھی وہ قاری کریم اللہ صاحب کے درجے میں منعقد ہوتی تھی اور کبھی اُس کے برابر والے کمرے یعنی مولانا نبی رضا صاحب کی درسگاہ میں، البتّہ بیشتر قاری صاحب کی درسگاہ ہی میں ہوتی تھی۔

(۴) اصل شعر درج ذیل ہے:

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

(۵) اُس وقت انجمن میں عموماً اساتذہ نہیں آتے تھے، حضور عزام میاں صدر ہوتے تھے اور آپ ہی کی جماعت سے کوئی مصلح مقرر ہوتا تھا، جس کا نام بھی دیگر لوگوں کی طرح انجمن کی لسٹ میں لکھا جاتا تھا۔

ورنہ ہم رِند تو بھِڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ

تو میاں! اگر سارا شہر ہی نصیحتیں کرنے پر اُتر آئے، تب تو حضرت رِند بھی رستہ بچا کر نکلنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ پھر ہمیں تو ویسے بھی صبح وشام انہیں حضرتِ "مصلح" کے ساتھ رہنا ہے۔ اِس لئے نشتر لگانے والے کے درد کو برداشت کرنے کی طرح "اصلاح" بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اِس سب کے باوجود کچھ مستِ بادۂ خوابیدگی وتسہل پرستی ایسے بھی ہیں، جن کی زبانوں کو مرشد جوّن کے درج ذیل شعر کا چسکا لگ گیا ہے۔ ککککام۔۔۔۔ ارے! کیا شعر ہے وہ؟ بھول گیا۔ اماں! وہ کیا کہا ہے مرشد نے؟ ہاں:

کام کی بات میں نے کی ہی نہیں
یہ مرا طورِ زندگی ہی نہیں

تو اب ایسے جنوں شعار وحاملینِ افکارِ حضرت مرشد جون اور جاں بکف فی سبیل التساہل پھِرنے والے افرادِ ذوی الاحترام کے سروں سے نشۂ تساہل پسندی وتن آسانی اُتارنے کے لئے قبلہ "تنبیہ الغافلین" کو دعوتِ عمل دی جاتی ہے۔ جو اپنی زوردار آواز اور دلچسپ نشانِ ضرب سے ایں حضراتِ تساہل پسندوں کو "**شہیدانِ انجمن گلشنِ بغداد**" کے عظیم مقام پر فائز کر دیتے ہیں۔

تو قبلہ! یہ تھی "**داستان ایمان فروشوں کی**"۔۔ نہیں نہیں۔۔ وہ تو کوئی ناول ہے۔۔؟ ہمم۔۔۔ تو پھر۔۔۔ ہاں! یہ تھی "**داستان تساہل پسندوں کی**"۔ اب صحیح ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

چلیں میاں! اب آپ اپنے آپ کو کسی جنگ کے میدان میں فرض کریں اور پوری توجہ سے جنگ کے آغاز سے قبل، سنائی دینے والی بانگِ جرس کو سنیں۔ سن لیا؟ ساری مستی وبیخودی اور بے فکری ہرن ہو گئی کہ نہیں؟ ہو گئی؟ بہت خوب۔ اب واپس لوٹ آئیں! میدان جنگ کی اُس بانگِ جرس کو ذہن میں رکھتے ہوئے، عشاء کی نماز اور کھانے سے فراغت کے بعد بجنے والی اِس گھنٹی کی آواز کو سنیں، جو بابنگ دہل اِس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ جو لوگ شعلگئ شمع حرم بھول چکے ہیں وہ اِس بانگِ جرس کو سن کر آہوئے گم گشتہ راہ کی رفتار سے سیدھے قاری صاحب کی درسگاہ میں پہونچ کر اپنی حاضری درج کرائیں، ورنہ ہفتے کی صبح سلام کے وقت (٦) جملہ خاص وعام کے سامنے آں حضرات عزت مآب کے ماہِ شان وتوقیر کو شق کیا جائے گا۔ اب "یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی" کہ

(٦) صبح کلاس شروع ہونے سے پہلے حضرت شاہ برکت اللہ مارہرویؒ کا لکھا ہوا عربی سلام: "یا شفیع الوریٰ سلام علیک" پڑھا جاتا تھا، بعد میں جس کی جگہ ترانۂ مدرسہ "اللہ حمد یعظم وبہ تزداد النعم" پڑھا جانے لگا البتہ اِس اسمبلی کے وقت کو آج بھی "سلام" ہی کا وقت کہا جاتا ہے۔

سبھی لوگ گھنٹی کی آواز سنتے ہی " حفظانِ صحت کے لئے۔؟" نہیں نہیں۔۔، پھر۔۔؟ ہفتے کی صبح علی الاعلان ہونے والی ذلّت ورسوائی سے خود کو محفوظ رکھنے کی نیت سے انجمن میں پہونچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، خاص کر ہم جیسے نَو وارِدانِ میکدہ۔

سب کے آنے کے بعد نذیر بھائی حاضری لیتے ہیں۔ یہ لو اب ایک اور نیا بکھیڑا کھڑا ہو گیا اور وہ یہ کہ کچھ لوگ اِن کو "نظیر" مثیل کے معنٰی میں لیتے ہیں اور کچھ لوگ "نذیر" ڈرانے والے کے معنٰی میں۔ بھئی !آپ کو جو معنٰی مراد لینا ہے، لو، مجھے اِس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ نظیر/نذیر بھائی آپ کو کوئی دقّت ہو تو براہ راست نپٹ لینا۔

کیا۔۔؟آپ کو ہمارے سینیئرز کے نام جاننا ہیں؟ کیا صاحب ! بیچارہ شیکسپئر کہہ کہہ کر مر گیا کہ "نام میں کیا رکھا ہے۔" اور آپ پھر بھی نام کے پیچھے پڑے ہیں۔ چھوڑیں، ایسے سمجھ لیں:

اُن ہی کا نام محبت اُن ہی کا نام جنوں
مری نگاہ کے دھوکے تری نظر کے فریب

اُفف ! خدایا۔۔ چلیں آپ کا دل رکھنے کے لئے چند ایک کے نام بتا دیتا ہوں: وہ سامنے مسند پر صدرِ انجمن حضور عزّام میاں صاحب تشریف فرما ہیں، اُن کے بالکل سامنے والی قطار میں مبشّر بھائی، کاشف بھائی، عاصم بھائی، خالد بھائی، انور بھائی، عبدالواحد بھائی، ناظم بھائی، رضوان بھائی، وغیرہ بیٹھے ہیں۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ امام شعرانی نے علمِ حدیث میں ایک مایۂ ناز کتاب تصنیف فرمائی ہے، جس کا نام ہے: "کشف الغمۃ عن جمیع الامۃ"۔ تو کیا اب آپ اس کتاب کے بابت معلومات فراہم کریں گے ؟ ارے نہیں، میں یہاں مذکورہ کتاب کے بارے میں گفتگو نہیں کرنے والا ہوں، بس اوپر کاشف بھائی کا نام سن کر "**کاشف**" کے اصل مصدر کی طرف ذہن چلا گیا، تو یہ کتاب یاد آگئی۔ اب کاشف بھائی کی بات نکل ہی گئی ہے تو آپ کو ان کے حوالے سے چند ایک باتیں اور بتاتا چلوں:

١. کاشف بھائی کو مدرسے میں "امام الامثلہ" کے لقب سے بھی جانا جاتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ امام الامثلہ کی مزید تشریح وتفسیر کرنے کی کوئی حاجت ہے۔ کیونکہ خود لفظِ "امثلہ" ہی اپنی تفسیر کرنے کے کافی ہے۔
٢. پورے مدرسے میں اگر کوئی بھی چھوٹا بچّہ بیمار ہے یا کسی کو باہر مارکیٹ سے کچھ منگانا ہے، تو اِس کا نقطۂ

اتصال صرف اور صرف کاشف بھائی کی ذاتِ بابرکت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے مدرسے کے تمام طلبہ کاشف بھائی کو "کاشف ماموں" کہتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ انجمن کی صف اول "والسابقون السابقون" اس کے بعد "ثم الذين يلونهم" اور پھر "الأمثل فالأمثل" کی سراپہ تفسیر کہی جاسکتی ہے۔

صَرف کی سلطنت میں رشتوں کی رَزم:

کیا کہا؟ پانچ خزانوں کا حصول بہت آسان ہے؟ بس بھائی رہنے دیں، جلے پر نمک نہ چھڑکیں۔ پنج گنج میں آپ کو کیا آسان لگا؟ پہلی بات تو اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ میاں! یہ "پنج گنج" کو "پنج گنج" کیوں کہتے ہیں؟ تو اُس کو بتاتے بیٹھو کہ چونکہ اِس کتاب میں پانچ ابواب ہیں اور ہر باب میں پانچ فصلیں ہیں اور چونکہ یہ کتاب علمِ صرف سے تعلق رکھتی ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی زبان کے لئے علمِ صرف کی اہمیت کسی خزانے کی دریافت سے کم نہیں ہے، اِس لئے اِس کا نام ہی "پنج گنج" رکھ دیا گیا ہے۔

اچّھا! پھر جیسے ہی وجہِ تسمیہ سے آگے بڑھو تو "افعالِ متصرفہ" اپنے ہمجولی "اسمائے متمکنہ" کے ساتھ سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجال ہے جو یہ دونوں اکیلے آجائیں، نہ جی نہ، یہ دونوں بھی اپنے حروف کی اقسام کے اعتبار سے اپنے اپنے چار ماتحتوں؛ صحیح، مہموز، معتل اور مضاعف کو لے آتے ہیں اور یہ ماتحتوں کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر ماتحت اپنے ساتھ اپنے تین چار چیلوں کو لئے چلا آتا ہے۔ پھر اُس کے بعد بیچارہ صحیح تو خاموشی سے اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ لیکن اُس کے جاتے ہی مہموز اپنے بھائیوں؛ مہموزِ فا، عین اور لام کے ساتھ اور معتل اپنے برادرانِ یک حرفی و دو حرفی کی معیت میں حاضر ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں معتل بدو حرف اپنے بیٹوں: معتل فا، عین اور لام کو بھی بلا بھیجتا ہے، جن کے آتے ہی لفیف مفروق و مقرون نیز مضاعف کے ہمراہ مضاعف ثلاثی و رباعی کی آمد ہوتی ہے۔ اُف! میرا تو گلا سوکھ گیا۔ رکیں! پانی پی لوں پھر آپ کو ان خاندان والوں کی خانہ جنگی کے بارے میں بتاتا ہوں یا چھوڑیں کسی کے اندرونِ خانہ ہونے والی باتیں، واقعات کا بتانا، سننا اچھی بات نہیں۔

میاں! مجھے تو آپ پھٹے میں ٹانگ اَڑانے والو کے قبیلے کے سردار لگ رہے ہیں۔ اور آج آپ اپنے جرگے میں یہ طے کرکے آئے ہیں کہ مہموز، معتل اور مضاعف کے گھریلو جھگڑے سنے بِنا، میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

اچّھا! تو پھر سنیں، ایک کا بتاتا ہوں باقی کا اندازہ لگا لیجئے گا۔ اوپر مہموز صاحب کے تین بھائی تھے، یاد ہے؟ اب اگر اِن تینوں بھائیوں میں کسی کی بھی اولاد میں دو ہمزے ہوں جن میں سے ایک تو شریر و "متحرک" ہو اور دوسرا بیچارہ سیدھا سادہ سکون والا "ساکن" ہو تو اب میاں دنیا جانتی ہے "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" لہٰذا اپنے "متحرک" اور قوانین و قواعد پر گرفت رکھنے والے بھائی کے سامنے بیچارے سیدھے اور "ساکن" ہمزے کے پاس بس ایک ہی چارہ بچتا ہے کہ وہ اپنے بھائی "متحرک" کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے، اپنے موجودہ وجود کی قربانی دے کر خود کو اپنے "متحرک" بھائی کی حرکت کے موافق حرفِ علت میں ڈھال لے۔ اب آپ "آمَنَ" ہی کو دیکھ لیں یہ اصل میں "أَأْمَنَ" تھا طاقتور بھائی نے اپنی حرکت کی بنا پر "ساکن" بھائی کو کنارے لگا دیا اور اپنی حرکت کے موافق حرفِ علت میں بدل دیا تو لو جی "أَأْمَنَ" ہو گیا "آمَنَ"۔

اچّھا! اب اور مزید باتوں میں نہ لگائیں۔ سالانہ امتحان سر پر ہے۔ تیاری کرنے دیں۔

"ویسے آپ نے بتایا نہیں کہ سالانہ امتحان کا نتیجہ کیا رہا؟" آپ کی جان کو بھی چین نہیں ہے۔ ہمیشہ آجاتے ہیں رزلٹ پوچھنے۔ ارے بھائی، پڑھائی لکھائی، امتحان اور نتیجوں کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے۔ کبھی اس کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کریں۔ "اوہ! مزاج یار خاصا برہم ہے، مطلب حسبِ سابق نواب صاحب، اس بار بھی اول آئے ہیں۔" میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھر کی طرف نکل گیا مگر عقلمند را اشارہ کافیست۔

اب کے برس کی دھوپ الگ تھی:

مشہور یونانی فلسفی ہراکلیتس کے بقول "Change is the only constant" تبدیلی ہی دنیا کی واحد مستقل چیز ہے۔ شاید اس لئے اس برس ہمارے مدرسے میں بھی کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

آپ کو مسجد کے برابر کا وہ لمبا والا کمرہ یاد ہے: جس میں حفظ کے طلبہ کی رہائش تھی؟ وہ وضو خانے سے سٹا ہوا کمرہ: جس میں مسجد کا بائیں جانب والا دروازہ بھی کھلتا ہے؟۔ جی جی! آپ بالکل صحیح سمجھے۔ اب وہ کمرہ ڈائنگ ہال میں تبدیل ہو گیا ہے۔ جبکہ حفظ اور درس نظامی کے طلبہ مدرسے کی بالائی منزل پر شفٹ کئے جا چکے ہیں۔ اچھا! اور وہ سنٹر ہال جس میں عرس قادری میں استعمال ہونے والے برتن رکھے جاتے تھے؟ وہی نا جس کے تین دروازے کامنی کے سامنے ہیں اور تین گوش محل کی طرف؟ جی! وہی والا۔ اب وہ حفظ کی درسگاہ ہے اور جو قاری کریم اللہ

صاحب کی درسگاہ تھی، اب وہ درس نظامی کے نام رجسٹرڈ ہو چکی ہے۔

یہ تو تھی مکانی تبدیلی۔ اب آتے ہیں زمانی اور ذہنی تبدیلی کی طرف۔ تو صاحب! معاملہ یہ ہے کہ سال اور کلینڈر جب تک نہیں بدلتے ہیں، بھاری اور برے لگتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ ماضی کی چادر اوڑھ کر آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں، تو اچانک کچھ کھویا کھویا سا لگنے لگتا ہے۔ ایسا ہی کچھ حال میرا ابھی ہے۔ گذشتہ سال جب وقت کا پہیا اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا، تو لگ رہا تھا کتنا دھیما گھوم رہا ہے۔ اور آج جب تعطیل کلاں کے بعد ایک نئے تعلیمی سال کا آغاز ہونے جا رہا ہے، تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے وقت بھاگ رہا ہو اور اس کے پیچھے بھاگ رہے ہوں ہم سب۔

متعینہ نصاب کے مطابق نئی کتابیں جاری کر دیں گئی ہیں۔ کل حضرت اقدس حضور تاجدار اہلسنت کے سامنے پہلا سبق پڑھا جائے گا اور بعدہ باضابطہ تعلیم کا آغاز۔

ضرب و کوب کی نئی ایڈنگ:

آج علم الصیغہ کا پہلا درس ہے۔ مولانا دلشاد صاحب نے علم الصیغہ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب مفتی عنایت احمد کاکوروی صاحب-رحمہ اللہ- نے کالا پانی کی قید کے دوران لکھی تھی۔ جیسے ہی میں نے مولانا کی یہ بات سنی، فوراً اپنے ہاتھ میں موجود کتاب کا نسخہ دیکھا: ڈارک کالی سیاہی سے چھپا ہوا۔ اصل متن کے الفاظ ایک دوسرے سے سٹے ہوئے۔ حاشیہ گنجلک اور سیاہی دو آتشہ، چھپائی ایسی کے کم روشنی میں پڑھو تو چشمہ لگ جائے۔ یہ سب دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا کہ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ کالا پانی میں لکھی گئی تھی بلکہ موجودہ نسخہ بھی سیدھا وہیں سے چھپ کر آیا ہے۔ جس پر کتاب کا طرزِ اشاعت شاہد ہے۔

ویسے تو علم الصیغہ بھی علمِ صرف ہی کی ایک کتاب ہے۔ جس کو عموماً پنج گنج کے بعد پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن دیگر اضافی مباحث کے علاوہ اس کتاب کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے خاتمے میں قرآن مجید میں مذکور مختلف ایسے صیغوں کو ذکر کیا گیا ہے جن کا تلفظ الگ ہوتا ہے اور رسم الخط الگ۔ مثلاً: أَمَّنْ، عَصَوَّ وغیرہ جس سے بحیثیت ایک طالب علم ہمیں نہ صرف ایسے اور صیغوں کو کھوجنے کی تحریک ملتی ہے بلکہ متعلقہ قواعد بھی ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں۔

ویسے امسال یک گونہ خوشی اس بات کی بھی ہے کہ بفضلہ تعالیٰ اس بار یاد کرنے والی صرف دو ہی کتابیں شامل ہیں:

ایک علم الصیغہ اور دوسری دروس البلاغت۔ اس لئے کوشش رہے گی کہ لاٹھی کے عذاب سے محفوظ رہا جائے اور کسی بھی قسم کی جسمانی اذیت سے خود کو مکمل بچا کے رکھا جائے۔ اب ضرب و کوب کے کھیل کی اس اننگ میں ہم ٹک کر بیٹنگ کریں گے یا کلین بولڈ ہوں گے، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ بس نام رہے اللہ کا۔

ہندی کا مکس کا چسکا:

چاچا چودھری اور چُناوی دنگل، چاچا چودھری اور ہائی وے کے لٹیرے، چاچا چودھری اور سابو کا اپہرن، چاچا چودھری اور سابو کے جوتے، وِش ہین ناگراج، ناگراج اور جادو کا شہنشاہ، ناگراج اور سوپر کمانڈو دُھرُو۔ غرض کہ چاچا چودھری کی دنیا ہو یا ناگراج اور سوپر کمانڈو دُھرُو کے سنسنی خیز قصے، ان سب سے ہمیں متعارف کروایا، ہمارے باغی مزاج ساتھی قبلہ محمد صابر سولہ پوری نے۔ محترم اعدادیہ سے ہمارے ساتھ ہیں اور تب ہی سے ہمیں اردو اِملا کا نہ صرف یہ کہ درس دیتے آرہے ہیں بلکہ کئی بار میرا ٹیسٹ بھی لے چکے ہیں۔ ایک بار تو اعدادیہ میں ماسٹر اقبال صاحب کے سامنے ہی بول پڑے کہ زیادہ اردو لکھنا آتی ہے تو ذرا مد ظلہ العالی یا دامت برکاتہم القدسیہ لکھ کر دکھاؤ۔ اب بھائی موصوف تو ماشاء اللہ حافظ قرآن بھی ہیں اور خوش خط بھی۔ جبکہ ہم پہلی بار کسی مدرسے کا منھ دیکھ رہے تھے۔ ہمارے سر پر تو یہ دونوں الفاظ اردو کے کسی بم کی طرح پھٹے۔ یہ الگ بات کہ ہم نے بھی ہار نہیں مانی اور کچھ تو لکھا جو نہ صابر سمجھا، نہ میں اور نا ہی ماسٹر اقبال صاحب۔ وَیل! تو میں یہ بتا رہا تھا کہ ہماری زندگی میں ان کامکس کی آمد، صابر کے توسط سے ہوئی۔ محترم یہ ساری کامکس بدایوں ٹڈی چوک سے کرائے پر لاتے ہیں اور پھر مل بانٹ کر پڑھتے ہیں۔ فی الحال تو کھیلنے کے علاوہ، یہی ہمارا وقت گذاری کا مشغلہ ہے۔ اب آگے کن نئے مشاغل سے بغل گیر ہوں گے، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

جس سے ڈر رہے تھے وہی بات ہو گئی:

اس سال کے آغاز میں سوچا تھا کہ اس بار اساتذہ کو ہمیں مرغہ بنانے کا موقع نہیں دیں گے اور دونوں یاد کرنے والی کتابوں کو اچھے سے یاد کر کے سنائیں گے۔ اب تک اپنے اس منصوبے میں کامیاب رہا ہوں۔ لیکن آج جب علم الصیغہ کی تکمیل کے بعد مولانا دلشاد صاحب نے جاتے جاتے یہ کہا: "کہ جمعرات کو پورا پچھلا سبق از

ابتدائے کتاب تا آخر سنوں گا اور وہ بھی ایک نشست میں"، تو یہ بات مجھے موت کے کسی فرمان سے کم نہیں لگی۔ جس کو سن کر دل نے کہا، کہ احمد میاں، اس جمعرات فرشتۂ موت کی زیارت یقینی ہے۔ گو آج ہفتے کا دن ہے لیکن جمعرات کا سوچ کر ابھی سے پیٹ میں ہولا ہو رہا ہے۔ "ہولا یا ہیولٰی؟" ارے یار ایک تو آپ سوال بہت کرتے ہیں۔ یہ ہولا ہی ہے، کیونکہ ابھی تک ہماری زندگی میں ہیولٰی کی آمد نہیں ہوئی ہے۔ جب ہوگی، تب پتہ چل جائے گا۔ فی الحال یہ بس ہولا ہے مطلبکہ گھبراہٹ۔ ویسے یہ بتائیں کہ کبھی آپ کو ایسا لگا ہے کہ وقت جہاں ہے وہی رک جائے اور آگے نہ بڑھے؟ ہیلو! کہاں کھو گئے؟ محترم، ہوش میں آیئے! کیونکہ ہر بات کی تان وصال یار پر نہیں ٹوٹتی، کچھ تانیں طعنوں اور ضرب و کوب پر بھی ٹوٹتی ہیں۔ اسی طرح وقت رکنے کی تمنا صرف قیس و فرہاد ہی نہیں کرتے ہیں، بلکہ ہم جیسے اسیرانِ علم الصیغہ بھی فریادی بن کر وقت کی دہلیز پر پڑے رہتے ہیں۔ لیکن آج تک نہ تو وقت کسی کی فریاد رسی کر پایا ہے اور نہ سمندر لہروں کی غمخواری بقول وسیم بریلوی:

کہاں لہروں کی غمخواری کرے ہے
سمندر ہے ادا کاری کرے ہے

تو میاں وقت نے تو رکنے سے منع کر دیا اور دن آگیا جمعرات کا، اور اب ہوگا موت کا ننگا ناچ، وہ بھی چبوترے پر: جب ایک ہی صف میں مرغے بنے ہوں گے احمد و نواب۔ بہر حال، موت کے کنوے کے کھیل کا آغاز نصیر سے ہوا۔ حافظے کی گاڑی نے دوڑنا شروع کیا، لیکن اچانک نِسیان کا روڈ بریکر آیا اور تیز رفتاری کی وجہ سے گاڑی سِلپ ہو گئی۔ حفاظتی عملے کے سربراہ کا حکم ہوا، مرغہ بن جائیں۔ اس کے بعد مجھے ریس میں آنے کی دعوت دی گئی، میری گاڑی بھی کچھ دور تک چلی اور پھر حافظے کا پیٹرول ختم ہو گیا۔ زہے نصیب کہ مسندِ مولانا سے ارشاد ہوا؛ "جایئے، احمد سعید صاحب! آج ہم آپ کو منصبِ مرغہ پر فائز کرتے ہیں۔" یکے بعد دیگرے سب کھلاڑی میدان سے باہر ہوتے رہے اور آخر میں وہ شُبہ گھڑی بھی آئی، جب ٹیم کے سارے کھلاڑی انڈور فیلڈ سے نکل کر اوٹ ڈور فیلڈ میں جسمانی کسرت کے سب سے مفید آسن: "مرغہ آسن" کرنے میں دل و جان سے مصروف ہو گئے۔

میرے خیال میں مرغہ بننے تک بھی ٹھیک تھا۔ ہاں! پندرہ بیس منٹ مرغہ بننے کی وجہ سے کان لال پڑ گئے ہیں۔ پیر درد کی شدت سے شل ہونے لگے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ بس ابھی ساتھ چھوڑ دیں گے۔ پھر بھی کسی طرح ایڑیوں اور پنجوں پر باری باری اپنا وزن شفٹ کر کے، تھوڑا بہت اوپر نیچے ہو کے یا کان کی لو کو بس چھو کر سزا پوری

کرنے کی کوشش جاری ہے۔ لیکن پھر اچانک مولانا صاحب نے چھڑی سے مرغہ بنے نصیر کی ایسی جگہ نشان دینا شروع کردئے، جو نہ وہ خود دیکھ سکتا تھا اور نہ کسی کو دکھا سکتا تھا۔اس کی عزت افزائی ہوتے دیکھ ،ہماری حالت خراب ہورہی ہے۔ کیونکہ جو پٹ رہاہے،اس کو تو مار کا درد ہے ، لیکن ہم جو پٹنے والے ہیں وہ دوہری اذیت میں گرفتار ہیں :ایک تو مرغہ بنے رہنے کی اور دوسری چھڑی پڑنے کے کاؤنٹ ڈاؤن کی۔ کاؤنٹ ڈاؤن کی اذیت ؟وہ کیا ہوتی ہے ؟جب چھڑی پڑے گی تبھی تو درد ہوگا اس سے پہلے کیسے ؟ لگتا ہے قسمت نے آپ کو مرغہ بن کر پٹنے کی نعمت سے اب تک محروم رکھاہے۔ کیونکہ اگرآپ کو کبھی مرغہ بن کر پٹنے کا شرف حاصل ہوا ہوتا توآپ اس کاؤنٹ ڈاؤن کی بے چینی کو بخوبی سمجھتے۔ قصہ مختصر یہ کہ ایک ایک کرکے سب کا نمبر آیا اور سب کو نشانِ بیت نصیب ہوا۔

مرغہ آسن باعثِ تیزئی دماغ:

غالباًآج مرغہ بننے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بدن میں خون کا دوران کافی اچھارہاہے بلکہ دماغ کی نسوں کو بھی دم مسفوح کی روانی عام دنوں کی بنسبت اچھی میسر آئی ہے۔ شاید اسی لئے آج کی کٹائی کے بعد، جب میں نے اساتذہ کے مارنے کے طریقے پر غور وخوض کرنا شروع کیا تو پتہ چلا، کہ ہر استاذ کے مارنے کا طریقہ دوسرے استاذ سے کافی مختلف ہوتاہے مثلاً مولانا دلشاد صاحب، جب ہاتھ پر چھڑی مارتے ہیں، توان کی شفقت کا مرکز ہتھیلی نہیں، بلکہ انگلی کے ناخن ہوتے ہیں۔ مولانا مجاہد صاحب ،مارتے وقت پیٹھ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔اسی لئے مارنے سے پہلے گردن پکڑ کے تپائی پر نیم دراز کرتے ہیں اور پھر پیٹھ پر چھڑیوں کی برسات۔اب رہا حضور کا اندازِ پٹائی، تو وہ مذکورہ دونوں حضرات سے کافی الگ ہے۔ کیونکہ حضور کھڑا کرکے، پیر، کمراور ہاتھ تینوں کو برابر برابر تبرک بانٹنے میں یقین رکھتے ہیں۔الحمدللہ،اب تک ہمیں تینوں حضرات سے ٹھیک ٹھاک پٹائی کھانے کا شرف حاصل ہے۔

وصلِ لاٹھی یا فراقِ شمع؟:

اب بس بہت اطنابِ مُمِل ہوا۔ حضور کے گھنٹے کا وقت ہوگیاہے اور وہ بھی "دروس البلاغت" کے۔ جس کو اچھے سے رٹنے کے بعد بھی کچا پکا یاد رہتاہے اور کل تو ویسے بھی حضور نے حسنِ تعلیل کی تعریف وتوضیح میں پیش کردہ ابوالعلاء المعري کے مشہور شعر :

وما　كُلْفَةُ　البَدْرِ　المنيرِ　قديمَةً

وَلٰكِنَّها فِي وَجْهِهِ أَثَرُ اللَّطِمِ

کی تشریح کرتے ہوئے تقریبِ فہم کے پیشِ نظر اُردو کا یہ شعر بھی سنا دیا تھا:

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

جس کے بعد مگس کے باغ میں جانے سے لے کر، پھول کا رس چوسنے تک اور پھر مدھومکھّی کے چھتّے سے نکلنے والے موم سے لے کر، محترمہ شمع کے معرضِ موجود میں آنے تک کا، وہ تخلیق اور آمد نامہ پڑھا گیا کہ بیچارے چچا غالبؔ نے گلی قاسم جان، بلیماران، پرانی دہلی میں واقع، اپنی حویلی سے یہ کہتے ہوئے ہماری درسگاہ کا رختِ سفر باندھا:

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

لیکن ہم بھی ٹھہرے علم وادب اور فکر وسخن کا گہوارہ کہے جانے والے، شہر بدایوں کے فرزند، لہٰذا اِس سے پہلے کہ چچا کچھ اور بولتے، ہم ہی موصوف کے انداز میں بول اٹھے:

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

خیر۔۔! مختصر یہ کہ آج حسنِ تعلیل کا سبق سنانا ہے اور وہ بھی بالکل اُسی انداز میں، جس انداز میں کل حضور نے ہمیں سمجھایا تھا۔ خدانا خواستہ، اگر کوئی اُس طرح وضاحت نہ کر سکا، تو اُس کے اور لاٹھی کے وصال کی رسومات حضور بنفسِ نفیس ادا کریں گے۔ لیکن یاد رہے، یہ وصل، وصلِ کامیابی نہیں، بلکہ خسارے کا سودہ ہے۔ کیونکہ آج صرف وہی کامیاب ہوگا، جس کو لاٹھی کا فراق نصیب ہو جائے گا۔ مطلب کہ:

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

حضور کی آمد ہو چکی ہے اور ہم سبق ساتھیوں میں سے، اب تک تسلیم اور نواب عالم سبق سنا چکے ہیں۔ میں فی الحال 'ٹک ٹک دید، دم نہ کشید' کی تصویر بنا، سب کو سبق سناتا دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا؟ بیچ کے کچھ ساتھیوں کو چھوڑ کر حضور مجھ سے سبق سنانے کو کہہ رہے ہیں۔ میاں! یہ تو بن موسم برسات والی بات ہو گئی۔ مگر ذرا قسمت کی ستم ظریفی تو

دیکھو کہ اس بات پر، میں احتجاج بھی نہیں کر سکتا۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا۔ حکم کی بجاآوری کرتے ہوئے، آہستہ آہستہ ،خدا خدا کر کر کے جیسے تیسے سبق سنایا اور حضور کی لاٹھی سے نجات پا کر اپنا نام ان چند خوش نصیبوں کی فہرست میں لکھانے میں کامیاب رہا، جو آج حضور کی لاٹھی اور چبوترے پر مرغہ بننے کی نعمتِ مترقبہ سے محروم رہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

ششماہی آخر میں علم الصیغہ کی جگہ مراح الارواح نے لے لی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ صرف روحوں ہی کے سکون کا باعث بن سکتی ہے، جسموں کے نہیں۔ کیا کہا؟ یہ رٹنے والی کتاب نہیں ہے۔ صرف سمجھنا اور پھر سمجھانا ہے۔ ارے واہ! مزہ آگیا۔ بھئی، میں اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرتا ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ یہ کتاب روح اور جسم دونوں کو راحت پہنچاتی ہے۔ آج سے اسی کو میرا موقف سمجھا جائے۔

یوں تو مراح الارواح سے پہلے بھی علم صرف کی تین کتابیں پڑھ چکے ہیں، لیکن اس کتاب میں مصنف الشیخ احمد بن علی بن مسعود علیہ الرحمہ نے جس فاضلانہ انداز سے مصدر اور فعل کے مابین اصل و فرع ہونے کے بابت بصریوں اور کوفیوں کے اختلاف کو ذکر کیا ہے، اس کو بس آپ پڑھتے جائیے اور سر دھنتے جائیے، نیز اس پر حضرت مولانا دلشاد صاحب کا واضح اور موئثر طریقۂ تدریس مستزاد۔

اگر اختصار سے بیان کروں، تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ کتاب میں اس اختلاف کی خِشتِ اول مصنف کے اُس قول سے رکھی جاتی ہے، جس میں آپ نے پہلے باب کی ابتدا کرتے ہوئے، لفظ 'الضرب' کو پیش کیا اور پھر یہ موقف بیان کیا: کہ "فقولنا الضرب مصدر يتولد منه الأشياء التسعة وهو أصل في الإشتقاق عند البصريين" کہ ہم نے ابھی ابھی جو یہ کہا کہ الضرب ایک مصدر ہے اور اس سے کل نو چیزیں مشتق ہوتی ہیں۔ (جیسے ماضی، مستقبل، امر، نہی، اسم فاعل، مفعول، ظرف مکان، ظرف زمان اور اسم آلہ)۔ یہی اسماء مشتقہ کی اصل ہے۔ بعدازاں، اپنے اس قول کی تائید میں، ان الفاظ میں ایک عقلی دلیل پیش کی کہ: "لأن مفهومه واحد ومفهوم الفعل متعدد لدلالته على الحدث والزمان والواحد قبل التعدد." کیونکہ مصدر کا صرف ایک مفہوم ہوتا ہے جبکہ فعل کے کئی مفہوم ہوتے ہیں: کبھی وہ کسی چیز کے ہونے (وجود میں آنے) کا مفہوم ادا کرتا ہے اور کبھی زمانے کا۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے، آپ اگر اعداد و شمار کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں، تو واحد ہمیشہ تعدد سے پہلے آتا ہے۔ لہذا مصدر فعل سے پہلا ہوگا اور جو پہلے ہوگا، وہ اصل ہوگا اور دوسرا اس کی فرع۔ لہٰذا مصدر اصل ہے اور

فعل اس کی فرع ہے۔اس پر کوفیوں نے بھی اپنے جواب دیئے اور بات کافی آگے بڑھتی گئی۔

میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ آپ کو فریقین کی ساری دلیلیں اور جواب بر جواب سناؤں۔ لیکن ایسا کرنے کی صورت میں، سوائے آپ کے بور ہونے کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ لہٰذا بس اتنا سن لیں: کہ بصریوں کے نزدیک مصدر اصل ہے اور فعل اس کی فرع ہے (صاحب مراح الارواح نے بھی اسی موقف کی وکالت وحمایت کی ہے) جبکہ کوفیوں کے نزدیک فعل اصل ہے اور مصدر اس کی فرع ہے۔ باقی اگر طبیعت اجازت دے، تو ایک بار مراح الارواح کی طرف رجوع ضرور کریں۔ رہے نام اللہ کا۔

کبھی کمبخت سالانہ:

ایک تو ذرا ٹھیک سے سانس لی نہیں کہ امتحان سر پر آجاتا ہے۔ کسی نے صحیح ہی کہا ہے:

جگر کا خون پیتا ہے یہ سوزِ امتحاں ظالم
کبھی سہ ماہ، کبھی شش ماہ، کبھی کمبخت سالانہ

ششماہی امتحان تو کب کا ہو گیا ہے اور اب باری ہے، کمبخت سالانہ کی۔ چلیں پھر تھوڑی دروس البلاغت کی رٹائی اور باقی کتابوں کو سمجھنے سمجھانے کی تیاری میں لگتے ہیں اور ملتے ہیں رزلٹ کے دن۔

اس سے پہلے کے آپ کچھ کہیں، میں ہی آپ کے گوشگذار کر دیتا ہوں کہ وہ کمبخت نوا با پھر سے اول آگیا۔ موڈ بہت خراب ہے، اس لئے مزید سوال وجواب کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ والسلام۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے:

ہم اوپر جماعت میں کیا آئے، ہمارے پیچھے کئی پیڑیاں آگئیں اور جیسے کچھ سالوں پہلے ہم کسی کَونے میں تسہیل المصادر، میزان ومنشعب، نحو میر وپنج گنج اور علم الصیغہ وغیرہ لئے رٹائی کرتے تھے، ویسے ہی یہ نَو وارِدان بھی کر رہے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہم زیرِ لب گنگنا رہے ہیں:

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

ہمارا تو تسہیل المصادر سے شروع ہوا مشنِ رٹائی؛ پنج گنج، نحو میر، علم الصیغہ اور جواہر المنطق سے ہوتا ہوا، آخر کار اپنے اختتام کو پہنچا۔ بفضلہ تعالیٰ، تین سال رٹائی کرنے کے بعد، اب وہ شبھ گھڑی آن پہنچی ہے، جب ہمیں طوطے کی طرح رٹنے سے نجات ملے گی اور بات صرف عبارت پڑھ کر سمجھانے تک ہی رہے گی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ لیکن نئے آنے والے طلبہ میں کچھ طلبہ رٹتے وقت اتنی زور زور سے ہلتے ہیں کہ بس نہ چلے ورنہ ہلتے ہلتے ایک دم چھلانگ لگا کر علاء الدین کی قالین پر سوار ہوں اور پہنچ جائیں علی بابا کا خزانہ لوٹنے۔ ارے یہ علی بابا کہاں سے بیچ میں آگیا؟ ویسے ہے تو یہ راز کی بات لیکن آپ تو میرے اپنے ہو تو آپ سے کیا چھپانا؟ پر آپ کسی کو بتانا مت۔ ٹھیک ہے؟ تو بات یہ ہے کہ یہ علی بابا کو میں جان بوجھ کر بیچ میں لایا ہوں۔ کیونکہ آج کل قصص العربیہ میں، ہم شیخ صاحب سے اُسی کی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ وہ غار کے سامنے کھڑا ہو کر علی بابا کہتا ہے: "کھل جا سم سم" ارے ہم تو عربی میں پڑھتے ہیں، اُس میں وہ کہتا ہے، "اِفتح سم سم"، شیخ صاحب کیا ایکسپریشنس کے ساتھ بول کر دکھاتے ہیں؛ تھوڑی سی آواز کو بھاری کر کے "اِفتح سم سم" اور ساتھ میں ہم سے بھی ان کی نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، ترجمہ کراتے وقت، کیا منظر کشی کرتے ہیں: ایسا لگتا ہے جیسے وہ سامنے غار ہے اور یہ کھڑا ہے علی بابا، جو ابھی پاس کو ڈبول کر غار میں گھس جائے گا۔

ویسے ایک اور راز کی بات بتاؤں؟ جی، بالکل، نیکی اور پوچھ پوچھ؟ شیخ صاحب کا پیریڈ کچھ ایسا ہے کہ لگتا ہے بس چلتا ہی رہے کیونکہ اُن کے گھنٹی میں نا ہمیں اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ اگر کچھ گڑبڑی کری تو پٹائی ہو گی اور نا ہی کوئی گڑبڑی ہوتی ہے۔ یہ کچھ زیادہ لمبی ہاک دی آپ نے۔ ارے، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ شیخ صاحب پڑھاتے نہیں ہیں، سبق گھول کر پلا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کبھی ہم لوگوں کے گھامڑ پنے کی وجہ سے، غلطی ہو بھی جائے، تب بھی کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں، بس ہلکی سی گوش مالی کرتے ہیں۔ گوش مالی میں مزا نہیں آیا، ایسا کرتے ہیں کہ اس کو یوں کر لیتے ہیں کہ ہلکے سے کان مروڑ دیتے ہیں۔ جبکہ اگر صحیح جواب دیا، تو ڈیسک سے نکال کر ٹافی۔ البتہ! کبھی کبھی ہم ساتھیوں ہی سے آپس میں ایک دوسرے کے مکا پڑوا دیتے ہیں اور اگر کسی نے خُنس میں زور سے مار دیا تو اُس کو مفت میں ڈانٹ پڑتی ہے: 'کہ بے وقوف اتنی زور سے مارتے ہیں؟'

خیر! اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ صبح سے شام تک صرف شیخ صاحب ہی کی گھنٹی رہے۔ لہٰذا چلیں، دوسرے استاذ کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، جی جی، آپ نے بالکل صحیح سنا۔ اس سال سے درسگاہوں کا نظام بدل چکا ہے۔ اب اسکولز کی

طرح حسبِ جماعت کلاس روم مخصوص کر دئے گئے ہیں اور اساتذہ اپنے اپنے پیریڈز کے حساب سے ہر کلاس میں پڑھانے جاتے ہیں۔

شیخ صاحب کلاس سے باہر جا چکے ہیں، تھوڑے پریشان و اُداس ہم بھی ہیں تھوڑے آپ بھی ہوں کیونکہ:

اُداسیوں کا سبب کیا کہیں بجز اس کے
یہ زندگی ہے پریشانیاں تو ہوتی ہیں

اب میری اِس بات سے آپ یہ نتیجہ اخذ کرنے کی غلطی نہ کریں کہ ہم باقی اساتذہ کو لائق اعتناء و احترام نہیں سمجھتے (العیاذ باللہ) بلکہ راقم الحروف کا ماننا ہے کہ بلا شبہ تمام اساتذہ، لائق صد ہزار احترام اور طالبِ علم کی تعلیمی و فکری اور اخلاقی و سماجی شخصیت کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ البتّہ ہر طالب علم کی کسی ایک یا چند اساتذہ کے تئیں الفت و محبت بنسبت دوسروں کے قدرے زیادہ ہوتی ہے: جس کو عصری اداروں میں(Favorite Teacher) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب رہی مجموعی طور پر اساتذہ سے وابستگی اور طلبہ کے تئیں اُن کی فکر مندی، تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جملہ اساتذہ اُن کے سپرد گلشنِ علم و حکمت کی ہر ایک کلی کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے سلسلے میں کسی طرح کی لاپرواہی نہیں برتتے، نیز ہمہ وقت علم و حکمت کے گوہر اپنے شاگردوں پر لٹانے کے لئے تیّار رہتے ہیں۔ اب باقی بچا طالب علم کا اپنا ذوق و شوق اور طلب و تشنگی کہ وہ خود کو کتنا زیورِ علم سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔

رہ گئی ہماری اور اساتذہ کے احترام کی بات تو بھئ! دیکھیں، ہم تو ٹھہرے غالؔب کے پرستار اور جب غالؔب:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئ استاد نہیں

کہہ سکتے ہیں۔ جس کی رو سے ایک **"لطمۂ موج"** بھی **"سیلئ استاد"** کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو پھر مجھ جیسا طالب علم جو پڑھنا لکھنا ہی **"لطمۂ مدرِّس و سیلئ استاد"** کے توسط سے سیکھا ہے، کس طور سے تعریضاً یا تلمیحاً بھی کسی استاذ کے بارے میں دریدہ دہنی کی جرات کر سکتا ہے؟

خیر! آپ یہ سب چھوڑیں، فی الوقت میرے پردۂ ذہن پر اساتذہ کی تعظیم و تکریم کے حوالے سے امیر الشعراء: احمد شوقی کے قصیدۂ لامیہ کے چند اشعار اُبھر رہے ہیں، آپ وہ دیکھیں:

قُم لِلمُعَلِّمِ وَفِّهِ التَبجيلا
كادَ المعَلِّمُ أَن يَكونَ رَسولا
أَعَلِمتَ أَشرَفَ أَو أَجَلَّ مِنَ الَّذي
يَبني وَيُنشِئُ أَنفُساً وَعُقولا
سُبحانَكَ اللَهُمَّ خَيرَ مُعَلِّمٍ
عَلَّمتَ بِالقَلَمِ القُرونَ الأولى (۷)

حد ہے، بات نکلی تھی شیخ صاحب کی درسگاہ اور آپ کے اندازِ تدریس کی اور آن پہونچی، اساتذہ کی تعظیم و تکریم تک، مطلب یہ تو وہی بات ہوگئی:

اک ترا ذکر تھا اور بیچ میں کیا کیا نکلا

بہر کیف! ہماری اِس تفصیل سے اساتذہ کی تعظیم و تکریم کے حوالے سے، ہمارا موقف آپ پر تو واضح ہو گیا ہو گا اور اگر اِس قدر وضاحت کے بعد بھی آپ کسی بھی قسم کے شش پنج کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھنا چاہتے ہیں، تو پھر آپ ہی مجھے بتادیں کہ میں آپ سے بالفاظِ قتیل شفائی:

اک یہی عیب ہے اِس شہر کے داناؤوں میں

کہوں یا پھر کلیم عاجز کا یہ شعر آپ کی نذر کر دوں:

سنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

القصص العربیہ کے علاوہ اس بار نصاب میں ترجمۂ قرآن، مشکاۃ شریف، اصول الشاشی اور قدوری وغیرہ شامل ہیں۔ ترجمۂ قرآن شریف بھی شیخ صاحب کے پاس ہے۔ مشکاۃ شریف اور قدوری مولانا دلشاد صاحب پڑھائیں گے۔ اصول الشاشی حضور سے پڑھیں گے اور انگریزی و ہندی محترم رضا سر سے۔

(۷) ترجمہ:

۱. استاد کے لیے کھڑے ہو کر اُس کا احترام کیا کرو، کیونکہ اگر نبی آخر الزماں ﷺ کے بعد کسی کو رسالت کا مقام مل سکتا، تو وہ استاد ہی ہوتا۔
۲. وہ ہستی جو انسانوں کی روحوں کو جِلا دیتی ہے اور دماغوں کو نئی روشنی دیتی ہے، یقیناً اس سے زیادہ عزت کے لائق کوئی نہیں۔
۳. اے اللہ! ساری پاکیزگی تیرے ہی لیے ہے، تو ہی وہ عظیم استاذ جس نے گزشتہ قوموں کو قلم چلانا سکھایا۔

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں:

سال میں چار بار ہمیں چھٹیاں نصیب ہوتی ہیں: ایک عید الاضحیٰ سے پہلے ہونے والے، سہ ماہی امتحان کے بعد، دوسری شش ماہی امتحان کے بعد اور تیسری تعطیل کلاں۔ اور چوتھی کونسے امتحان کے بعد؟ چوتھی چھٹی کی خاصیت یہی ہے کہ یہ بغیر کسی امتحان کی صعوبت جھیلے میسر آتی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ ہمیں پڑھائی سے نجات ملتی ہے بلکہ پورے ایک ہفتے کی یک گونہ آزادی بھی حصے میں آتی ہے۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ بنا امتحان کے چھٹی؟ کچھ وضاحت کریں۔ ابھی کئے دیتے ہیں، مگر اُس سے پہلے، علامہ کا یہ شکوہ سنیں:

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلا

کچھ بوجھا؟ نہیں۔ چلو چھوڑو! ایک اور شعر سنو:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اس سے بھی کچھ نہیں سمجھے؟ شعر تو سمجھ گیا لیکن۔۔۔ لیکن بعد میں، ابھی یہ شعر دیکھو:

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ

اُف! احمد صاحب! علامہ کے اشعار تک تو ٹھیک ہے، لیکن میرے خیال میں یہ اشعار بے محل ہیں اور کسی طور آپ کی بات سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ میں نے آپ سے چوتھی چھٹی کے بارے میں پوچھا ہے اور آپ ہیں، کہ مجھ میں اقبالی روح پھونکنے کو اُتاؤ وہیں۔

شاباش! ایک بدایوں والے سے ایسے ہی نفیس ذوق کی امید تھی۔ یہ اشعار یقیناً بے محل ہیں اور ان کا میری بات کے سیاق سے دور دور تک کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ پھر آپ نے کیوں سنائے؟ بَور ہو رہا تھا۔ سوچا ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے، آپ کو زچ ہی کر دوں، شاید بوریت میں افاقہ ہو۔

تو اب اگر افاقہ ہو گیا ہو، تو مدّے کی بات کریں؟ جی جی بالکل۔ پھر بتائیں یہ چوتھی چھٹی کا کیا راز ہے؟ جی، ہماری شروعاتی گفتگو میں، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمارا ادارہ ایک تعلیمی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ، ہندوستان میں

سلسلۂ قادریہ کا ایک عظیم روحانی مرکز بھی ہے۔ جو تقریبا پچھلی دو صدیوں سے بندگانِ خدا کا رشتہ خالقِ حقیقی سے جوڑنے کا کام کر رہا ہے۔

ہر سال ۱۵ تا ۱۷ محرم الحرام، خانوادۂ عثمانیہ میں اس روحانی سلسلہ کے بانی و مورث اعلیٰ افضل العبید، قدوۃ الاصفیاء حضور شاہ عین الحق عبدالمجید قادری عثمانی بدایونی۔ قدس سرہ العزیز۔ کے تین روزہ عرس قادری مجیدی کا انعقاد ہوتا ہے۔ جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مقامی و بیرونی اہل ارادت و محبت خانقاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ جس کی تیاری کے لئے، عرس سے ایک ہفتہ پہلے ساری تعلیمی سرگرمیاں موقوف کر دی جاتی ہیں اور تمام طلبہ دیوان خانہ اور درگاہِ قادری کی صفائی میں لگ جاتے ہیں۔ دیوان خانہ: چونکہ سال بھر بند رہتا ہے۔ اس لئے برسات، سردی اور گرمی کے تھپیڑے کھانے اور گرد و غبار کے ستم سہنے کی وجہ سے وہ بھی ہمدردئ صفائی کا خواہ ہوتا ہے۔

عرس کی پہلی صبح، حویلی شاہ عین الحق قدس سرہ العزیز (رہائش گاہ حضور صاحبِ سجّادہ۔ اطال اللہ ظلال فضلہ علینا) سے آثارِ مبارکہ کا جلوس نکلتا ہے۔ جس میں سب لوگ تبرکات شریف کے ساتھ درگاہِ قادری پہنچتے ہیں۔ درگاہ پہنچ کر، تبرکات شریف کو اگلے دن زیارت کرانے کے لئے، متعینہ کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھوٹی درگاہ ہی میں محفلیں ہوتی ہیں۔

چھوٹی درگاہ؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ ارے ہاں! آپ نے ابھی تک درگاہِ قادری کہاں دیکھی ہے۔ جلدی آئیں، بنا کسی جغرافیائی تفصیل میں جائے، میں فٹافٹ آپ کو درگاہ دکھا لاتا ہوں۔ یہ دیکھیں، درگاہ کے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی، بائیں طرف، حوض اور اس کی دونوں جانب چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح دائیں طرف بھی کچھ کوٹھریاں ہیں، اور ان سے سٹ کر، یہ جو ایک راہداری دکھ رہی ہے، یہ لنگر خانے کی طرف جاتی ہے۔ صدر دروازے کے بالکل سامنے، وہ ہرے رنگ کا گنبد دیکھ رہے ہیں۔ جی۔ چلیں اس کے اندر جانا ہے۔ داخل ہوتے ہی، شمال و جنوب میں یہ ایک ایک کمرہ ہے اور آگے یہ ایک چھوٹا سا کمرا ہے: جس میں قالین وغیرہ رکھی جاتی ہیں۔

یہ اس حصے کا مین ہال ہے۔ جنوب میں چار مزارات دیکھ رہے ہو۔ ہاں! سب کے سامنے نام کی تختیاں لگی ہوئی ہیں: مشرق کی طرف سے حضور سیف اللہ المسلول، حضرت الشاہ فضلِ رسول قادری بدایونیؒ، ان کے برابر اعلیٰ حضرت تاج الفحول الشاہ عبدالقادر قادری بدایونیؒ، بعدہ سرکار صاحب الاقتدار، حضرت الشاہ عبدالمقتدر قادری

بدایونیؒ اور آخر میں قادری دولہا، عاشق الرسول، حضرت الشاہ عبد القدیر قادری بدایونیؒ آرام فرما ہیں۔ اس ہال والے حصے کو، چھوٹی درگاہ کہتے ہیں۔ وہ جو سامنے پڑا سا کھلا ہوا صحن ہے، جس کے بیچ میں ایک مزار نظر آرہا ہے: وہ حضرت افضل العبید، شاہ عین الحق عبد المجید قادریؒ کا مزار ہے۔ درگاہ کے اس حصے کو بڑی درگاہ کہتے ہیں۔

چھوٹی اور بڑی درگاہ کی زیارت کرانے کے لئے آپ کا سپاس گذار ہوں۔ اب ذرا عرس کی محفلوں کے بارے مین کچھ بتائیں۔ کیوں نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ عرس کی محفلیں چھوٹی درگاہ میں ہوتی ہیں: جن میں حضرت اقدس، صاحبزادگان اور دیگر شعراء بدایوں کے ساتھ ساتھ بیرونی مقامات سے آئے ہوئے، اہل سخن حضرات بھی اپنا اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ کسی محفل میں پڑھا گیا کوئی شعر یاد آرہا ہے؟ ایسے تو کافی اشعار یاد آرہے ہیں۔ جیسے قبلہ حضرت عزام میاں صاحب کے یہ اشعار سنیں:

زمانہ ہو مری ٹھوکر میں اور خدا مل جائے
اگر گدائے مدینہ کا مرتبہ مل جائے
نظر اٹھا کے نہ دیکھوں ہلالِ عید کبھی
اگر تراشۂ ناخنِ مصطفٰی مل جائے
جو آرزو ہے جبیں کی وہ پوری کردوں گا
کہیں سے مجھ کو پیمبر کا نقشِ پا مل جائے

یا پھر محترم ماموں جان حضرت سید منظر میاں چشتی صاحب کے یہ چار مصرعے دیکھیں:

ابھی یہ کون آیا تھا یہ کس کے قد کے سائے تھے
ہمارے دل کے دروازے یہ کس نے کھٹکھٹائے تھے
تلاش و جستجو کرتا مدینے تک میں جا پہنچا
پتہ پھر یہ چلا یادِ نبی کے جھونکے آئے تھے

ہمارے والد گرامی محترم محمد میاں شارؔب بدایونی صاحب کا یہ مقطعہ بھی سنتے چلیں:

ایک دو جام سے کیا ہوگا بھلا شارؔب کا
آج جی بھر کے صراحی سے پلا دے ساقی

نکہت و نور کی برکھا میں نہائی ہوئیں محفلیں، ایک طرف باعثِ تسکینِ قلب و جگر ہوتی ہیں تو دوسری طرف مقربینِ بارگاہِ خداوندی کے فیضانِ نظر کے حصول کا سبب۔ نماز کی جماعت اور ذکر کی محفلوں میں، رحمت کی گھٹا ایسے جھوم کر آتی ہے اور ٹوٹ کر برستی ہے، کہ اس سے سارے لوگ سر تابقدم بھیگ جاتے ہیں اور ایک ایسی حسن و جمال کی فضا قائم ہوتی ہے، جس کی عکاسی شاید ممکن نہیں ہے۔ بقول جگر مرادآبادی:

تیرے جمال کی تصویر کھینچ دوں لیکن
زباں میں آنکھ نہیں آنکھ میں زبان نہیں

تیسرے دن فجر کے فوراً بعد قل کی محفل ہوتی ہے اور لوٹنے والے یہ کہتے ہوئے رخصت لیتے ہیں:

الفت کی نظر پھر سے یا مرشدی مولائی
ہوتے ہیں تیرے در سے رخصت تیرے شیدائی

انجمن: تربیت، ترتیب اور تہذیب کا سفر:

ہم نے گلستاں میں شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا تھا کہ:

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہ حفتہ باشد

انسان کے چاہے عیب ہوں یا ہنر، جب تک وہ بولتا نہیں ہے تب تک دونوں چھپے رہتے ہیں۔ ہر ہفتے مدرسے میں منعقد ہونے والی، تربیتی بزم 'انجمن گلشن بغداد'، ہماری اسی بولنے اور اظہارِ مافی الضمیر کی صلاحیت کو صیقل کرنے کا کام کرتی ہے۔ تلاوت کرتے وقت کیسے بیٹھنا ہے؟ نعت کا ترنم کیسا ہونا چاہئے؟ کہاں ہائی نوٹ لینا اور کہاں لو نوٹ؟ نعت پیش کرتے وقت کیسے کھڑا ہونا ہے؟ تقریر میں حرکات و سکنات کیسی ہونی چاہئے؟ کہاں رکنا ہے اور کس بات پر زور دینا ہے؟ مواد و انداز کیسا ہونا چاہئے؟ نقابت و نظامت میں تعارف کس طرح اور کتنا پیش کرنا ہے؟ کونسے اشعار کب پڑھنے ہیں؟ فرق مراتب کا لحاظ کیسے برتنا ہے؟ یہ ساری وہ باتیں ہیں جو ہمیں انجمن سے سیکھنے کو ملتی ہیں۔

آپ کو تو خیر معلوم ہی ہے کہ ہر سنیچر کی صبح انجمن کی لسٹ نوٹس بورڈ پر لگا دی جاتی ہے اور جس طالب علم کا

نام، جس کٹیگری میں ہوتا ہے وہ اس چیز کی تیاری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں نامزدگی کے بھی کچھ اصول ہیں: مثلاً تلاوت و نعت خوانی کے لئے، عام طور پر صرف حفظ اور اعدادیہ کے طلبہ ہی کو نامزد کیا جاتا ہے جبکہ تقریر میں اولیٰ سے لیکر فضیلت تک کے طلبہ کی حصداری رہتی ہے۔ اب رہی نظامت: تو اس میں عام طور پر بڑی جماعت کے طلبہ ہی کا نام ڈالا جاتا ہے۔ اور ہاں حضرت مصلح کی نامزدگی والی روایت اب ختم ہو چکی ہے۔ ارے! پر ایسا کیوں؟ اب سے پہلے تو حضرت مصلح بھی نامزد کئے جاتے تھے؟ پھر اب کیوں نہیں؟ جی، آپ نے بالکل صحیح فرمایا، پہلے جیسا کہ آپ نے کہا، ویسا ہی تھا مگر اب انجمن میں اساتذہ کی بھی شرکت رہتی ہے، اس لئے اصلاح بھی انہیں میں سے کوئی کر دیتا ہے۔

خدایا! یہ سالِ تعلیمی کم اور سالِ تبدیلی زیادہ لگ رہا ہے۔ وہ کیوں؟ وہ اس لئے کیونکہ انجمن کے نظام میں ایک بڑی تبدیلی یہ بھی آئی ہے کہ اب وہ پہلے کی طرح کسی بھی رنڈم کمرے میں منعقد نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف اور صرف سنٹرل ہال ہی میں اس کا انعقاد ہوتا ہے البتہ وقت ابھی بھی عشاء کے بعد ہی کا ہے۔

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں:

کہتے ہیں کہ لمبے سے لمبے سفر کی شروعات بھی ایک قدم آگے بڑھانے سے ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیا کے بڑے سے بڑے خطیب و مقرر نے بھی ابتدا میں اپنی تقریریں رٹ کر، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، یا محض زبانی مشق کر کے ہی اپنا سفرِ خطابت شروع کیا ہوتا ہے۔ ہم سب بھی اسی روایت پر چلتے ہوئے تقریر کے میدان میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انجمن کے ابتدائی دنوں میں سب کی تقریریں اکثر مارکیٹ میں رائج تقریری کتابوں سے منتخب کی جاتی ہیں۔ پھر کئی کئی دن ایک ہی تقریر کو یاد کرتے، الفاظ کو ترتیب دیتے، آواز میں اتار چڑھاؤ کی مشق کرنا اور ہر ممکن کوشش کرنا کہ انجمن میں روانی کے ساتھ سب کچھ ادا ہو جائے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دماغ میں سب کچھ محفوظ ہوتا ہے، لیکن پوڈیم پر پہنچ کر الفاظ کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں اور زبان اٹکنے لگتی ہے۔ ایسے موقعوں پر دل کی دھڑکنوں کی رفتار یوں بڑھ جاتی ہے جیسے سینے میں کوئی طبلہ بجنے لگا ہو۔ مگر ہر بار کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملتا اور آہستہ آہستہ اعتماد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ابتدائی دور میں کئی موقعے ایسے بھی آتے ہیں: جہاں زبان کا پھسل جانا، تلفظ کی غلطیاں یا جملوں کا ترتیب سے ہٹ

جانا، ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی کوششوں سے ہی ہمیں بولنے کا سلیقہ آتا ہے اور سوچنے سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی پہلی تقریر "اسلام میں عدل و مساوات کا نظام" کے عنوان پر کی تھی۔ جس کو پورا ہفتہ تقریر کی ایک کتاب سے یاد کیا تھا اور بڑی جان فشانی کے بعد انجمن میں کر پایا تھا۔ لیکن آپ کو ہمیشہ رٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جیسے جیسے تعلیمی سفر آگے بڑھتا ہے، آپ کی مشق اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے اور پھر رٹنے کی جگہ ذہن سازی لے لیتی ہے اور آپ کو محض اپنے موضوعِ خطاب اور متعلقہ مواد کو دیکھنا ہوتا تھا؛ الفاظ خود بہ خود زبان پر آنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض لوگ زندگی بھر رٹنے کی بیساکھی پر ہی رہتے ہیں اور اسی دم پر اپنی خطابت کا سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہ تو تھی تقریر کی کہانی، رٹنے والے مقرر کی زبانی۔

لیکن انجمن میں تقریر کے علاوہ ایک اور چیلنجنگ کام ہے، جس کا نام سن کر بہتوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ ہے نظامت۔

کارِ نظامت کو ہم لوگ انجمن کے سب سے مشکل عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی تمام چیزیں: تلاوت، نعت خوانی اور تقریر بس پانچ دس منٹ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن بیچارے حضرت ناظم کو از ابتداء تا انتہاء اپنی کارکردگی پیش کرنی ہوتی ہے اور وہ بھی پورے تسلسل اور حاضر دماغی کے ساتھ۔ چاہے انجمن میں تمہیدی کلمات پیش کرنا ہوں یا پھر تلاوت و ثناخوانی کے بعد موزوں اشعار کی پیشکش، جنابِ واعظ کو دعوتِ سخن دینی ہو یا حضرتِ ناصح کو زحمتِ کلام، بحیثیت نقیبِ بزم، آپ کو ہر محاذ پر اپنے زبان کے جوہر بکھیرنا ہوتے ہیں: جو کوئی آسان کم نہیں ہے، خاص طور پر ایک ایسے ماحول میں جہاں آپ کے ساتھی اور اساتذہ سامعین کی صف میں بیٹھے ہیں اور آپ کی تمام حرکات و سکنات پر نظر جمائے ہیں۔

شروعاتی دور میں نظامت کے لئے بھی چند کتبِ رائج الوقت سے ہی رجوع کیا جاتا ہے اور وہی روایتی تمہید و اشعار:

صحراء میں جنگلوں میں بیابان میں پڑھو
دیوار گر پڑے تو میدان میں پڑھو

یا پھر:

آ مری قوم کے فرزند اجالا لے کر
واسطے قوم کے پیغام نرالا لے کر

کے سائے میں قاری و خطیب کو دعوتِ سخن دی جاتی ہے۔ البتہ عام طور پر نعتیہ و منقبتیہ کلام حضرتِ اقدس کے نعتیہ مجموعوں: معراجِ تخیل، مدینے میں یا اعلیٰ حضرت تاج الفحول مولانا الشاہ عبد القادر بدایونیؒ کے دیوانِ منقبت سے منتخب کر کے پڑھے جاتے ہیں۔

انجمن، نظامت اور اشعار کا پرچہ:

مائکروسوفٹ کے فاؤنڈر، بِل گیٹس نے کسی موقعے پر کہا تھا: "کہ کاہل و آلسی لوگوں کو کام دینے میں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کام کو جلدی ختم کرنے کا کوئی نہ کوئی شارٹ کٹ نکال لیتے ہیں۔" بِل گیٹس کی اس بات کو ہم سہل پسندوں نے کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے لے لیا اور انجمن میں بحیثیت ناظم نام آنے کی صورت میں، بجائے اس کے کہ ہفتہ بھر اس کی تیاری کی جائے اور کچھ اشعار یاد کر کے بزم میں آیا جائے، ہم نے ایک شارٹ کٹ نکالا کہ پورا ہفتہ اشعار یاد کرنے کی زحمت اٹھانے سے اچھا ہے، کہ بدھ کی رات کو حسبِ تعدادِ شرکاءِ انجمن، منتخب اشعار کا ایک پرچہ تیار کیا جائے، اور دورانِ نظامت پوڈیم کی سہولت کو استعمال میں لاتے ہوئے، اسی پرچے سے دیکھ کر حسبِ موقع اشعار پیش کرنے چاہئے، مطلب کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

کچھ دن تو اس ترکیب نے کام کیا اور بآسانی مجھ سمیت کئی ناظموں نے اپنی نظامت کے فرائض، بنا خود کو اشعار یاد کرانے کی مشقت میں ڈالے، نہ صرف یہ کہ بخوبی انجام دئے بلکہ خوب واہ واہی بھی لوٹی۔ لیکن:

موت تو اک وقفۂ آرام ہے اے زندگی
ایک دن قبروں سے ہم زندہ اٹھائے جائیں گے

اب یہ وقفۂ آرام کب تک چلتا ہے، اور کب قبرِ لاپرواہی سے ہمارا بعث ہوگا، اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑتے ہیں۔

اس بار انجمن میں میری نظامت ہونی ہے۔ اس بات کے علاوہ، آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ اب انجمن رات کو نہیں بلکہ دن میں ہوتی ہے اور وہ بھی پڑھائی کے اوقات میں۔ تو پھر پڑھائی کب ہوتی ہے؟ پڑھائی بھی ہوتی ہے

لیکن صرف چار پیریڈز۔ ویسے آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ عموما مدرسے میں سات پیریڈس ہوتے ہیں: تین نصف اول میں اور چار نصف ثانی میں۔ نیز نصف اول کی تین گھنٹیوں کے بعد ۲۰ منٹ کا وقفہ ہوتا اور بعدہ باقی کی چار گھنٹیاں۔ البتہ جمعرات کو نصف اول میں تین کی بجائے، چار پیریڈس پڑھائی ہوتی ہے اور اس کے بعد وقفہ اور پھر انجمن۔

مُدّے پر آتا ہوں۔ اپنی کاہلانہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے، ہم نے اس بار بھی اپناوہی پرچی والا ہتھکنڈا اپنایا ہے اور بڑے سلیقے اور نزاکت سے انجمن کی فہرست سے سٹا کر اپنی سنجیونی بوٹی پوڈیم پر رکھ دی ہے۔

تمہید اور تلاوت کے بعد نعت خواں کو دعوت دی۔ حسبِ معمول انجمن کی کاروائی چلتی رہی۔ نعت خواں کے جانے بعد ایک تقریر ہوئی اور پھر منقبت کے لئے دعوتِ سخن پیش کی گئی۔ ابھی میں طالب علم کو منقبت کے لئے دعوت دے ہی رہا تھا کہ اتنے میں پیچھے سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور۔۔آپ کی پیٹ پر نشان چھوڑ گیا؟ حد ہے یار، آپ کا تعلق ایک ایسے دیش سے ہے، جس کے راشٹر یہ پِتا مہاتما گاندھی ہیں جو کہ تشدد کے سب سے بڑے مخالف تھے اور آپ ہیں کہ تشدد کی بات کر رہے ہیں، وہ بھی پوری بات سنیں بغیر۔ کمال کرتے ہیں۔ معذرت قبلہ! اصل میں آپ کی ماضی کی داستان میں جب جب ہاتھ نمودار ہوا ہے، تب تب آپ کی پیٹ یار خسار کو سرخ کئے بغیر نہیں مانا ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ شاید:

پھر وہی زندگی [تمہاری] ہے(۸)

زندگی میں اگر آپ جیسے خیر خواہ ہوں، تو تا قیامِ قیامت وہی زندگی رہے گی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ خیر! پوڈیم پر واپس چلتے ہیں۔ میری پشت سے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، ہمارا اشعار والا پرچہ جا چکا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو ہمارا پرچہ قبلہ مولانا مجاہد صاحب کے دستہائے اقدس میں لیٹا، ان کے چہرے کی زیارت کرنے میں مشغول تھا۔ پرچہ جاتا دیکھ پوری بزم کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ پرچے کے ۹۰ فیصد اشعار مجھے پہلے سے ہی یاد تھے، اس لئے پرچہ جانے کے بعد بھی میں مسلسل بولتا رہا اور اسی انداز میں اشعار پڑھتا رہا۔

(۸) غالب کا اصل شعر حسبِ ذیل ہے:

پھر اسی بے وفا پے مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

بزم کے اختتام پر مولانا مجاہد صاحب نے مجھے بلایا اور بولے کہ یہ پرچہ کس لئے لکھتے ہو؟ ایک ہفتے پہلے لسٹ لگتی ہے، تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا ہے، کہ ایسے منھ اٹھا کر آنے کی بجائے، دس پندرہ اشعار یاد کر کے آجاؤ۔ لاپرواہی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں گردن جھکائے چپ چاپ سنتا رہا اور پھر پرچہ واپس ملنے پر باہر نکل گیا۔
مولانا صاحب کی بات کا مجھ پر تو خاصا گہرا اثر ہوا اور اس کے بعد میں نے وہ پرچہ لکھنا یکسر بند کر دیا۔ ویسے بھی مجھے اشعار کچھ جلدی ہی یاد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ گھر میں بھی ابّا (محترم محمد میاں شارب بدایونی) کے کلام کو میں یا میری چھوٹی بہن ہی ڈائری میں لکھا کرتے ہیں، تو شعر و شاعری سے ہمارا رشتہ کوئی نیا نہیں ہے۔ بقول فانی بدایونی:

ہو بھی چکے تھے دامِ محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقید زمان و مکاں نہ تھا

لفظوں کا چراغ، نوٹس بورڈ کے لئے:

مدرسے کی زندگی صرف کتابوں، اسباق، اور امتحانوں کی گرد میں گھومتی نہیں۔ یہاں ہر لمحہ ایک نیا رنگ لیے ہوتا ہے — کبھی چبوترے پر لڑکوں کی ہنسی کی گونج، کبھی انجمن میں اٹھنے والی صدا، اور کبھی ایک معمولی سا نوٹس بورڈ، جس پر چپکی ہوئی چند سطریں پورے ماحول کو بدل دیتی ہیں۔

اسی معمولی نوٹس بورڈ نے میرے لئے اس دن ایک خاص چراغ جلایا — وہی چراغ جو نہ صرف لفظوں کی روشنی تھا بلکہ دوستی اور ذمہ داری کی پہلی جھلک بھی تھا۔

خدایا! میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ چھوڑو یہ سب۔ تم یہ شعر سنو:

سرخیاں اخبار کی گلیوں میں غل کرتی رہیں
لوگ اپنے بند کمروں میں پڑے سوتے رہے

اور عامر سہیل کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

ذرا سی چائے گری اور داغ داغ ورق

یہ زندگی ہے کہ اخبار کا تراشا ہے

بشیر مہتاب کا یہ شعر بھی کمال کا ہے:

مجھ کو اخبار سی لگتی ہیں تمہاری باتیں

ہر نئے روز نیا فتنہ بیاں کرتی ہیں

ساتھ ساتھ خلیل مامون کے اس کرب کو محسوس کریں:

ایسے مر جائیں کوئی نقش نہ چھوڑیں اپنا

یاد دل میں نہ ہو اخبار میں تصویر نہ ہو

واہ ! واہ !آپ نے شعر تو بہت کمال کے سنائے ہیں۔ لیکن سارے اشعار اخبار ہی کے بارے میں کیوں ہیں ؟آپ صرف آم کھانے پر اکتفا کیوں نہیں کرتے ہیں؟ کیا ہر بار بال کی کھال نکلنا ضروری ہے ؟ میرے لئے تو ہمیشہ ضروری ہوتا ہے۔اسی لئے بہتر ہو گا کہ آپ اشعار سنانے کی وجہ بھی بتادیں۔

دل تو نہیں ہے لیکن:

جو خوشی آپ کی وہ میری خوشی بسم اللہ

ہماری انجمن گلشنِ بغداد یاد ہے کہ بھول گئے ؟انجمن کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ پچھلی بار جب انجمن کی بات نکلی تھی۔اس وقت وہ دن میں منعقد ہوتی تھی۔ اب کیا پھر کوئی تبدیلی ہوئی ہے ؟ نہیں نہیں، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔ بس، میرے کندھوں پر ایک نئی ذمداری عائد کر دی گئی ہے۔ کیسی ذمداری ؟رپورٹ بنانے کی۔ رپورٹ ؟انجمن کی ؟ جی۔ اوہ !اور یہ رپورٹ کونسے اخبار میں چھپے گی ؟ انقلاب یا کسی اور اردو اخبار میں ؟رپورٹ ہندی میں بنانی ہے۔ کیا۔۔۔ ؟ ہندی میں ؟ پھر یہ رپورٹ امر اُجالا میں چھپے گی یا دَینک جاگرن میں ؟آپ کا مسئلہ کیا ہے ؟ بات بات پر سوال۔ پہلے سامنے والی کی بات تو سن لیا کریں پھر

سوال پوچھا کریں۔ ابھی میرا جملہ ختم نہیں ہوتا ہے کہ آپ کا سوال آجاتا ہے۔

معذرت محترم! لیکن مجھے مجیب بننے سے زیادہ، سائل بننا اچھا لگتا ہے۔ اس لئے سوال زیادہ کرتا ہوں۔ اور ہاں! آپ بھی کوئی کم سوال نہیں کرتے ہیں۔ بھول گئے، گھر پر سب آپ کو 'کیوں کی ماترا' کہتے ہیں؟ یہاں گھر کی باتیں نہ کرو۔ تو پھر بتائیں انجمن کی رپورٹ کس اخبار میں چھپے گی؟ کسی اخبار میں نہیں۔ پھر رپورٹنگ کا فائدہ؟ یقیناً علامہ کے پاس بھی کوئی آپ جیسا سر پھرا آیا ہوگا۔ جس کو سمجھانے کے لئے انہوں نے یہ شعر کہا ہوگا:

ابنِ سینا در غبار ناقہ گم

دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

ویسے یہ تو اچھا ہی ہوا کیونکہ اگر وہ سر پھرا نہ آتا، تو ہم لوگ اتنے اعلیٰ شعر سے محروم رہ جاتے۔ آپ سے بحث کرنا ہی بیکار ہے۔ جی، وہ بھی یہی کہتے ہیں۔ اب بتائیں رپورٹ کا کیا ماجرا ہے؟

رپورٹ کا ماجرا یہ ہے کہ حضور عزام میاں کا حکم ہوا ہے کہ ہر ہفتے انجمن کی سرگرمیوں کی رپورٹ جداریہ (وال میگزین) کی طرح نوٹس بورڈ پر لگانی ہے۔ جس میں تلاوت سے لے کر نعت خوانی اور خطابت سے لے کر نقابت تک کی تفصیلات اور اہم نکات کو ذکر کرنا لازمی ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے نا۔ خاک اچھی بات ہے۔ میں نے آج تک کبھی کچھ لکھا نہیں ہے تو رپورٹ کیسے بناؤں گا۔ رپورٹ بنانے تک بھی ٹھیک تھا۔ لیکن نوٹس بورڈ پر لگا کر پورے مدرسے کو پڑھنے کی دعوت دینا۔ کسی خودکشی سے کم تو نہیں ہے۔

احمد میاں! آپ کے علامہ صاحب نے کبھی کہا تھا:

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم

جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

تو بس اپنا اعتماد بحال کریں اور کود جائیں اس خندقِ رپورٹنگ میں۔ ہمم۔ ٹھیک ہے۔

آج جمعہ کا دن ہے۔ انجمن کی رپورٹ بنالی؟ کل انجمن کے دوران نوٹس بنالئے تھے۔ رپورٹ آج رات کو بناؤں گا۔ چلیں! پھر رات کو ملتے ہیں۔ تب تک آپ یہ شعر گنگناتے رہیں:

اتفاقات زمانہ بھی عجب ہیں ناصر

آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سنا کرتے تھے

میرے خیال میں اب تک رپورٹ بن کر تیار ہو گئی ہو گی۔ جی، رپورٹ تیار ہے۔ میری تحریر بہت خراب ہے۔ اس لئے رف کاپی چھوٹی بہن کو سونپ دی ہے۔ فیئر ہونے کے بعد کل صبح نوٹس بورڈ پر لگادوں گا۔ میں سونے جارہا ہوں۔ شب بخیر۔

خاکسترِ یاد سے اٹھتی نئی عمارتیں:

اس سال مدرسے آنے کے بعد مجھے پھر سے ہراکلیتس صاحب یاد آگئے اور ساتھ میں یاد آیا موصوف کا یہ قول:"No man ever steps in the same river twice"مطلبکہ کوئی بھی انسان ایک ہی دریامیں دوبارہ قدم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ جب تک وہ انسان لوٹ کر آئے گا، تب تک نہ تو دریا پہلے جیسا رہے گا اور نہ ہی وہ انسان۔

آمدن بر سرِ مطلب، حاجی پارک اور اس کے بغل والا حضرت اقدس کا گھر تو آپ کو یاد ہی ہو گا؛ جس میں شرافت بھائی اینڈ فیملی رہتے ہیں؟ یا بھول گئے؟ اور وہ بیت البرق؟ ہاں! بجلی والا کمرہ۔ اب کے جو ہم نے مدرسے میں قدم رکھا، تو ایک بڑی تبدیلی دیکھنے کو ملی: حاجی پارک فنا کا جام پی چکا تھا اور اس کی جگہ ایک لمبا اور چوڑا کچن نام کا کمرہ، اس خطۂ زمین کا دعویدار بن بیٹھا تھا۔ شرافت بھائی اینڈ فیملی، گھر خالی کر کے جا چکے تھے جبکہ گھر کا بیشتر حصہ اوندھے منھ اور بچا ہوا ایک کمرا، چار دیوواروں کے کندھوں پر تھا۔ بجلی والا کمرہ راہئ ملکِ عدم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا دبنگ کمرہ آگیا تھا: جس کو سب آفس کے نام سے پکار رہے تھے۔

اب کوئی دبنگیائی دکھائے یا غنڈہ گردی کرے۔ موسم بدلے کہ برکھا برسے، ہمیں کیا، ہم تو جارہے ہیں اپنی کتابیں لینے کیونکہ کل سے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے۔

جشنِ استقبالیہ اور فضیحتانہ نظامت:

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ایسا ہی کچھ معاملہ میرے ساتھ بھی ہوا۔قصہ یہ ہے کہ مدرسے کے انتظامیہ امور کے سربراہ، تسنیم بھائی، حج سے واپس آئے تھے، جس کی مناسبت سے مدرسے میں ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد عمل میں آیا اور اس تقریب کی نظامت کے لئے راقم کا انتخاب ہوا۔انتخاب کی وجہ ہمارا انجمن میں مستقل طور پر بحیثیت ناظم شرکت کرنا بنی۔

خیر! محفل کا آغاز ہوا۔میں نے مختصر سی تمہید باندھی اور دورانِ تمہید تقریب کی مناسبت سے کچھ اشعار بھی پیش کئے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا، کہ اگر وقت خراب ہو تو اونٹ پر بیٹھے انسان کو بھی کتا کاٹ لیتا ہے۔تو ہوا کچھ یوں کہ تمہید کے دوران اور بعد میں بھی، میں نے جو اشعار پیش کئے،ان میں کچھ جگہ پر عین کا تلفظ الف ہو گیا، غین کا گاف اور قاف کا کاف۔ جس کا احساس مجھے تو بالکل نہیں ہوا اور میں اپنے پورے اعتماد کے ساتھ نظامت کرتا رہا۔

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پوچھیے اپنی جبیں سے

وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ جب دورانِ محفل، کسی نے آپ کو نہیں ٹوکا تو پھر آپ کو کیسے بتا چلا کہ آپ کی کشتیٔ تلفظ عین- غین اور قاف- کاف کے سمندر میں ہچکولے کھانے کی وجہ سے غرقِ آب ہو چکی ہے؟

اس کا ایک بیک گراؤنڈ ہے۔اس استقبالیہ محفل کے انعقاد سے کچھ دن یا ایک ہفتہ پہلے، مجھے بتایا گیا تھا کہ اس بار عرسِ قادری کی آخری محفل "قادری مجیدی کانفرنس" میں نظامت کے لئے، جن ناموں پر چرچہ ہو رہی ہے،ان میں ایک نام میرا بھی ہے: جو شاید فائنل بھی ہو جائے۔ابھی یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ تسنیم بھائی کی حج سے واپسی پر،اس استقبالیہ تقریب کا انعقاد ہوا اور اس میں میری نظامت۔اب اس کو وقت کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے، کہ ایک ایسے موقع پر، جب میں پہلی بار حضرت اقدس، شیخ صاحب، عشقی صاحب اور بدایوں کی عوام کے سامنے مدرسے کی کسی محفل میں نظامت کے فرائض انجام دے رہا ہوں،اُسی محفل میں میری کشتیٔ تلفظ کو عین- غین اور قاف- کاف کے سمندر میں ہچکولے کھانے تھے،جو آج تک کسی انجمن کی نظامت کے دوران نہیں ہوا۔ یہ بات میں، یقینی طور پر اس لئے بھی کہہ سکتا ہوں، کیونکہ پچھلے دو سال میں آج تک تلفظ کے حوالے سے

میری کسی غلطی کی طرف کسی بھی استاذ نے نشاند ہی نہیں کی ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ دو سال کے دورانیہ میں، کی جانے والی نظامت کے دوران، میں نے آج تک کوئی ایسا لفظ استعمال ہی نہ کیا ہو، جس میں عین غین یا قاف کاف آتے ہوں۔ بہر کیف، اس تلفظی بلنڈر کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرس سے چند دن پہلے، جب میں عرس میں آنے والے علماء و مشائخ کا تعارفی خاکہ لینے کے لئے، شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا، کہ بیٹا! اس بار تمہاری نظامت رہنے دیتے ہیں۔ تسنیم بھائی کرلیں گے۔ یہ سن کر میں، لائبریری سے واپس آگیا۔

اگلے دن کچھ احباب سے مجھے پتہ چلا کہ میرا نام عرس قادری کی نظامت سے یہ کہتے ہوئے مسترد کیا گیا ہے کہ جس انسان کو عین غین اور قاف کاف کے تلفظ کا تمیز نہیں ہے، اس سے عرس کی محفل میں نظامت کیسے کرائی جاسکتی ہے؟ عین غین کا تلفظ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ارے تم نے محفلِ استقبالیہ میں نظامت کی تھی نا، اس میں تلفظ گڑبڑا گئے تھے۔ اوہ! اب میں سمجھا۔

<u>ہم پہ گزری ہے، تمہارے واسطے فسانہ ہے:</u>

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بلنڈر اور میری رسوائی کا چرچہ شش جہاتِ مدرسہ میں عام ہے۔ ایک میں ہی ہوں، جواب تک اس بات سے بے خبر تھا یا یہ کہوں کہ بتانے والوں کی دلچسپی غلطی کی اصلاح سے زیادہ، میری ہرزہ سرائی میں تھی۔ کیونکہ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا، تو شاید پہلے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ناکہ جگ میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔

بعض لوگوں کے لئے شاید یہ واقعہ نجی محفلوں میں ہنسی مذاق کا موضوع ہوتا ہوگا۔ لیکن میرے لئے اس کا نتیجہ حد درجہ منفی تھا۔ وہ اس لئے کہ اس واقعے کے بعد، اگلے کئی مہینوں تک کسی نہ کسی چیز کو لے کر یہ بات بطور طعنہ میرے لئے استعمال ہوتی رہی۔ گو کہ یہ سب سن کر میں بھی کافی حیران ہوں کہ آج تک انجمن میں اس طرف نشاند ہی کیسے نہیں کی گئی؟ یا پھر یہ غلطی ہوئی تو صرف ایک ہی بار ہے، لیکن غلط جگہ ہوگئی ہے اور ویسے بھی:

خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

خیر! ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ یوں تو میری یہ پہلی بڑی نظامتی کوشش ایک تلخ مگر سبق آموز تجربہ بن گئی، لیکن زندگی نے سکھادیا کہ بعض اوقات ایک معمولی لغزش بھی بڑے امتحان میں ڈال دیتی ہے اور جگ ہنسائی کا

سبب بن جاتی ہے۔

واعظ کی مجالس میں صفا کیش نہ جائیں:

حاجی پارک کے سامنے والے نیم منہدم شدہ گھر کا جو کمرہ، دیواروں کے کندھوں پر جھولتے ہوئے، اپنا جنازہ اٹھنے کا منتظر تھا، اس کی زندگی میں ہمارے عبد الرحمان بھائی مسیحا بن کر آئے اور اس کو موت کے دہانے سے کھینچ کر زندگی کی راہ پر لے آئے۔ ارے ! واہ! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ پھر ابھی اس کمرے میں عبد الرحمان بھائی رہنے لگے ؟ نہیں نہیں، وہ وہاں رہنے نہیں آئے ہیں۔ پھر ؟ انہوں نے وہاں ایک کیفے کھولا ہے۔ اوہ! یہ بات۔ تو پھر ہمیں دکھائیں آپ کا نیا کیفے۔ جی، بالکل۔ آیئے۔

تو یہ ہے، ہمارے عبد الرحمان بھائی کا کیفے، جس کا نام ہے "کیفے بغداد"۔ بغداد کا نام سن کر یہ جو آپ کو عربی میں بات کرتی ہوئی ایک پاکیزہ ہستی نظر آ رہی ہے؟ پہلے میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو اِن کا نام بتاؤں گا لیکن پھر مجھے لڈّن جعفری یاد آ گئے اِس لئے اب "میں نہیں بتاؤں گا"۔ آئیں ذرا سنیں تو کہ حضرت کیا فرما رہے ہیں: "أحبتي الأعزاء، إنني في قمة الفرح والسعادة حيث إني جالس في هذا المقهى وأشرب الشاي معكم وأسمع كلماتكم الرائعة المملوئة بالللل....."۔ "او بھائی، ٹھہر جائیں، اتنی گاڑھی عربی نہ بولیں ورنہ یہ جو آپ کے ارد گرد میزان منشعب، پنج گنج، علم الصیغہ، نحو میر، ھدایۃ النحو اور توضیح النحو جیسی کتابیں پڑھے بیٹھے ہیں، یہ آپ کے صیغوں کی صرفی تعلیلیں کرنے کے بعد، جملوں پر ایسے نحوی قواعد کا انطباق کریں گے کہ آپ عربی کی قے کر کے، اُردو کے آنسوؤں سے روئیں گے اور کانوں سے فارسی کا دھواں نکلے گا"۔

اب جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا کہ حضرت واعظ کا اسم گرامی بتانے کی گستاخی میں ہر گز نہیں کروں گا کیونکہ "ایسی باتیں بتائی نہیں جاتیں، نظر لگ جاتی ہے" لیکن جنہوں نے ابھی ابھی عربی کی قے، اُردو کے آنسو اور کانوں سے فارسی کا دھواں نکلوانے کی دھمکی دی ہے وہ ہیں جگت کے خان صاحب **توصیف الحسن قائم گنجوی**۔

عصر کے بعد، سید صاحب، توصیف، جیلانی اور ضمیر وغیرہ یہیں بیٹھ کر وقت گزاری کرتے ہیں۔ میں بھی عصر کی نماز پڑھا کر یہیں آجاتا ہوں۔ یہ سید صاحب کون ہیں؟ میرے خیال میں، نام تو سید صاحب نہیں ہو گا؟ سید صاحب، مطلب سید عادل کلیمی چشتی صاحب۔ آپ شاید بھول گئے۔ ہماری شروعاتی گفتگو میں میں نے ان کا

تعارف کرایا تھا، لیکن خیر، عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے:

"الانسان مرکب من الخطاوالنسیان"—انسان غلطی اور بھول کا مجموعہ ہے، تو چلئے، میں آپ کو دوبارہ یاد دلاتا ہوں۔

سید صاحب، شیخ صاحب کے خالہ زاد ہیں اور میران پور کٹرا شریف کے ولی عہدِ سجادہ بھی۔ جماعتِ اعدادیہ سے میرے مشفق و کرم فرما ہیں۔ صاحب نسبت ہونے کے ساتھ ساتھ، انتہائی نرم خو اور ملنسار۔ یہ سمجھ لو کہ:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

دوراہے پر کھڑا مسافر:

امسال میں سادسہ جماعت میں ہوں اور سالانہ امتحان کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود بھی میری طبیعت پڑھائی کی طرف مائل نہیں ہو پا رہی ہے۔ جی میں بس ایک ہی خیال آ رہا ہے کہ اب آگے یہاں نہیں پڑھنا ہے، اب کسی اور جگہ جا کر پڑھوں گا۔ کسی ایسے مدرسے میں جانا ہے: جہاں عربی ادب پر خاص توجہ دی جاتی ہو اور پڑھانے، لکھانے کے ساتھ بولنے کی بھی مشق ہوتی ہو۔ اس خیال نے کب عملی جامہ پہن لیا، مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ بہر حال، تیاری کے لئے مدرسے جانا بند کر چکا ہوں۔

لیکن صرف مدرسے جانا بند کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے گھر میں بھی تو بتانا پڑے گا کہ مدرسے کیوں نہیں جا رہا ہوں۔ سو آج ہمت کر کے پاپا امی کو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے اور میری بات سنتے ہی حسبِ توقع دونوں برہم ہو گئے ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے جو کب ختم ہو گا مجھے نہیں معلوم۔

آج مولانا دلشاد صاحب نے فون کر کے ملنے بلایا ہے، سو مدرسے جا رہا ہوں۔ دیکھتے ہیں ان کے پاس کہنے کو کیا ہے۔ مغرب کے بعد مدرسہ پہنچا ہوں۔ سارے لوگ امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں اور میں مولانا سے ملنے اوپر لائبریری میں جا رہا ہوں۔ مولانا صاحب نے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں، مجھے سالانہ امتحان میں بیٹھنے پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، آپ نے یہاں تک کہا کہ تم آگے پڑھنا نہیں چاہتے، ٹھیک ہے، مت پڑھنا لیکن

پورے سال جو محنت سے پڑھائی کی ہے، اس کے لئے کم سے کم امتحان میں تو بیٹھو، اگلے سال نہ آنا اور ویسے بھی بس ایک ہفتے کی ہی تو بات ہے۔ ان سے پاسِ ادب میں، میں نے کوئی بحث نہیں کی اور ہاں میں ہاں ملا کر گھر واپس آگیا ہوں۔ لیکن سالانہ امتحان میں نہیں بیٹھ رہا ہوں۔ سالانہ امتحان ختم اور مدرسے کی چھٹی شروع۔

اک بھول، دو برس کا سفر:

معروف امریکی سیاستدان و خطیب ولیئم جیننگز برائن (*William Jennings Bryan*) کا بہت مشہور قول ہے کہ: "Destiny is not a matter of chance, it is a matter of choice" یعنی: ''تقدیر اتفاق سے نہیں بنتی، بلکہ یہ ہمارے انتخاب کا نتیجہ ہوتی ہے۔'' بالفاظ دگر ہم اپنی زندگی میں جو بھی صحیح یا غلط فیصلہ لیتے ہیں یا انتخاب کرتے ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ہماری زندگی پر اثرانداز ضرور ہوتا ہے۔

پچھلے سال میں نے اپنی ضد کے آگے نہ والدین کی سنی اور نہ اساتذہ کے منانے سے سالانہ امتحان میں بیٹھا۔ بات اگر یہیں تک رہتی تب بھی کچھ ٹھیک تھا لیکن وقت کی ستم ظریفی تو دیکھیں کہ میں کہیں اور پڑھنے بھی نہیں گیا بلکہ اب جبکہ مدرسے کی چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں اور نئے داخلے شروع ہو گئے ہیں، میں پھر سے ایک بار اسی دس سالہ پتلے دبلے بچے کی طرح ابا کے ساتھ مدرسے جا رہا ہوں؛ داخلہ کرانے یا سفارش کروانے؟

ابا کے ساتھ لائبریری میں شیخ صاحب کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوں۔ ابا نے داخلے کی بات کی تو شیخ صاحب غصے میں بولے: "یہ مدرسہ ہے کوئی نانی کا گھر نہیں کہ جب من چاہا آگئے اور جب دل کیا چلے گئے اور ویسے بھی اب میں مدرسے کی ذمداری سے عزام میاں کے حق میں دستبردار ہو چکا ہوں تو ان سے بات کرو۔" وہاں سے ناامید ہو کر میاں کے پاس گئے، تو انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا کہ "کوئی داخلہ نہیں ہو سکتا، واپس آنا تھا تو گئے کیوں تھے؟ یہ سب باتیں پڑھائی چھوڑنے سے پہلے سوچنی تھیں۔ فی الحال تو کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ تم نے سالانہ امتحان نہیں دیا ہے، اس لئے سادسہ ہی میں رکھنا پڑے گا اور اس سال سادسہ جماعت میں کوئی نہیں ہے اور صرف تمہارے لئے میں ایک جماعت نہیں بناؤں گا۔ البتہ، خامسہ میں داخلہ دے سکتا ہوں۔" خامسہ میں داخلہ مطلب دو سال پیچھے؟ "ہاں! اگر ٹھیک لگے تو آجاؤ ورنہ تمہاری مرضی۔" اب میں ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں جہاں آگے کنواں ہے اور پیچھے کھائی۔ اصولاً تو اگر کوئی طالب علم سالانہ امتحان نہیں دیتا ہے یا فیل ہو جاتا ہے تو اس کو اسی کلاس

میں رکھا جاتا ہے نا کہ اس کلاس میں جس کو وہ پہلے ہی پاس کر چکا ہے۔ خیر!

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

لہٰذا بادلِ نخواستہ، خامسہ میں جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ دلبر داشتہ ہوں اور خود سے نالاں بھی، مگر کیا ہی کر سکتے ہیں۔ ویسے اس سارے معاملے کا دلچسپ پہلو یہ کہ میں مدرسہ کی تاریخ کا وہ واحد فرد ہوں جس کو امتحان نہ دینے کی وجہ سے دو سال پیچھے کیا گیا ہے ورنہ عام طور پر امتحان نہ دینے والے یا تو اسی درجے میں رہتے ہیں یا پھر پروموٹ کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا پہلی بار ہوا کہ کسی کو امتحان نہ دینے کی پاداش میں دو برس پیچھے کیا گیا ہے۔ سو یہ امتیازی تمغہ بادل شکستہ ہی سہی ہم اپنے سینے پر لگا لیتے ہیں، بقول شاعر:

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے
آپ اِس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

میرے تمام ہم جماعت ساتھی اب تک میرے خامسہ میں جانے کی بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ نواب اور سفیان دو تین بار مجھ آواز دے چکے ہیں اور میرے نہ جانے پر برہم بھی ہیں۔ لیکن جب کلاس باضابطہ شروع ہوا، تب ان پر اشکارا ہوا کہ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ خامسہ میں میرے ساتھ ہیں: تسلیم، ریحان اور کیف الحسن۔ تسلیم اور میں اعدادیہ میں بھی ساتھ تھے لیکن پھر ایسا کیا ہوا جو یہ دو سال پیچھے ہوئے یہ مجھے یاد نہیں آرہا۔

"ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا"، ابھی میں دو سال پیچھے ہونے کے صدمے سے ابھرا بھی نہیں ہوں کہ میرے ماضی نے پھر مجھ ایک ضرب لگا دی۔ ہیں، وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ چونکہ میں خامسہ کی ساری کتابیں پہلے پڑھ چکا ہوں، اس لئے اساتذہ کا حکم ہے کہ اس بار ساری کتابیں میں پڑھاؤں گا اور وہ سنیں گے اور کتابیں ہیں؛ ہدایۃ الحکمت، تفسیر نسفی، ترمذی شریف، ازہار العرب، نور الانوار اور توضیح النحو مطلبکہ:

ایک دو زخم نہیں سارا بدن ہے چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اٹھے

پڑھتے پڑھاتے کہاں سال بیتا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ حد تو یہ ہے کہ سالانہ امتحان بھی ہو گیا اور آج رزلٹ ملنا ہے۔ تو اس بار کون اول آیا؟ نواب تو اب ساتھ نہیں ہے تو کیا آپ فرسٹ آئے؟ ہاں! اس بار تو میں ہی اول آیا۔ جب تک وہ کمبخت نوابا ساتھ تھا، مجال ہے جو فرسٹ آنے دے۔ کمبخت نے کیا ہی تیز دماغ اور زیرک طبیعت پائی ہے۔

چلیں اگلے برس ملتے ہیں۔فی امان اللہ۔

تیر انگاہِ شوق کوئی رازداں نہ تھا:

پچھلے کچھ برسوں سے ہاسٹل میں قیام کا سلسلہ منقطع ہے اور گھر پر رہ کر ہی پڑھائی جاری ہے۔البتہ مغرب اور عشاء کے بعد مدرسے جاکر تکرار و مطالعہ کرنا بہر حال لازمی ہے اور ایسا نہ کرنے پر سرزنش و سزا کا حقدار ہونا یقینی۔

آج کل درسی کتابیں کم اور اردو ناول وڈائجسٹ زیادہ پڑھنے میں آرہی ہیں۔طُرفہ تماشا یہ کہ رفیقِ دیرینہ، حضرتِ موبائل کی رفاقت بھی میسر ہے،تو پیغامات کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور انٹرنیٹ کی ہمسفری میں عالمِ خاک وبود کی سَیر گاہیں بھی آباد رہتی ہیں۔ویسے تو محترمہ فیسبوک کی زندگی میں آمد ۲۰۱۰ءیا ۲۰۱۱ء ہی میں ہوگئی تھی، لیکن اب رسم وراہ کچھ زیادہ ہے،سو دن کا ایک بڑا حصہ عالمِ سوشل میڈیا کی سیر میں بھی بسر ہورہا ہے۔

کتب بینی کا حال تو کچھ معلوم نہیں۔ہاں !کتب بیزاری بامِ عروج پر ہے۔گو کہ مطالعہ میں حد درجہ کفایت شعاری برتی جارہی ہے، مگر لایعنی ولن ترانیوں میں وقت یوں بے دریغ لٹایا جارہا ہے جیسے حاتم طائی اپنے خزانے فقیروں پر لٹاتا ہو۔ہاں، ہم سب کے بیچ،ابھی بھی کچھ جیالے ایسے ہیں جو ابھی تک مطالعہ کی شمع جلائے ہوئے ہیں اور تاریک راہوں میں آفتاب کا نہ سہی،کم سے کم جگنوؤں کا کام تو کر ہی رہے ہیں اور ویسے بھی:

چمن میں اختلاط رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہم ہی ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تم ہی تم ہو تو کیا تم ہو

یہی اسباب کیا کم تھے کہ اس پر ناخدا تم ہو:

سال کے آغاز ہی سے کفایتی پڑھائی کا علمبردار رہا ہوں۔جتنا پڑھنے سے امتحان پاس ہوجائے،بس اتنا ہی پڑھنے پر اکتفا کیا ہے۔اس تبدیلی کی کوئی خاص وجہ ؟خاص وجہ۔۔۔ ہمم۔۔۔آپ شعر سنیں:

دل ہی اچھا نہ ہو تو کچھ بھی نہیں اچھا لگتا
سایۂ گیسوئے دلدار نہ اچھا موسم

احمد صاحب! شعر اچھا ہے، پر یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ بھئی! آج اس شعر پر ہی اکتفا کریں، جواب کسی اور دن۔

ویسے ہم تو سمجھتے تھے:

یہ علم کا سودا یہ رسالے یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لئے ہیں

اور اب تک اسی گمان میں جی بھی رہے تھے۔ لیکن اب کے برس سالانہ امتحان نے ایک نیا ٹویسٹ اور دلچسپ موڑ لے لیا ہے۔ وہ کیا؟ وہ یہ کہ اب تک کی معلومات کے مطابق، بس نصاب میں شامل کتابوں کا امتحان ہونا تھا، لیکن آج جو خبر ہمارے کانوں سے ٹکرا کر راہئ ملک عدم ہوئی ہے، اس کے مطابق سادسہ اور ثامنہ (۹) کے طلبہ کو ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھنا ہے اور صرف لکھنے تک بھی بات ہوتی، تب بھی سہہ لیتے، لیکن یہاں تو پانی سر سے اوپر جا چکا ہے۔ کیونکہ اس تحقیقی مقالے میں پاس ہونے لائق نمبر بھی لانے ہیں اور ستم یہ ہے کہ چیکنگ خامہ تلاش قبلہ شیخ صاحب کریں گے۔

خیر! اب جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو موسل سے کیا ڈرنا۔ سبھی سابقہ و حالیہ ہم درس و ہم سبق ساتھی موضوع کے انتخاب اور مواد کی تلاش میں سر گرمِ عمل ہیں۔ سو میں بھی ہوں: کیونکہ کاہلی کا مطلب کند ذہنی یا نالائقی ہر گز نہیں ہوتا ہے۔ میں بھی سوچ وِچار کر رہا ہوں کہ اپنی اس تحقیقی کاوش کی تان کس موضوع پر توڑی جائے: آیا کسی تاریخی بحث پر قلم اٹھایا جائے۔ یا کسی ادبی رسالے کی نوک پلک سنواری جائیں۔ کسی مختلف فیہ فقہی قضیہ کی موشگافی کی جائے یا پھر بس کام چلانے لائق، کوئی مقالہ لکھ کر، اللہ بھروسے جمع کر دیا جائے۔ اِس فکری خلجان سے نبرد آزما ہونے کے بعد، میں نے '**علمِ تفسیر کے تدوینی مراحل**' کو اپنے مقالے کا موضوع منتخب کیا۔ حالانکہ اس موضوع کا انتخاب کوئی مشکل کام نہیں تھا، کیونکہ ابھی کچھ سال پہلے ہی نصاب میں شامل، کلیۃ المعلمین، ریاض سعودی عرب میں، دراساتِ قرآنیہ کے استاد: ڈاکٹر فہد بن عبد الرحمٰن بن سلیمان الرومی کی کتاب 'بحوث فی اصول التفسیر ومناہجہ' نظر نواز ہوئی تھی۔ دورانِ درس ہی کتاب کے مشمولات دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا تھا اور ایک دو بار یہ خواہش بھی پیدا ہوئی تھی، کہ اگر اس کتاب کا اردو ترجمہ کر دیا جائے، تو ایک اچھا اور

(۹) صرف سادسہ اور ثامنہ اس لئے، کیونکہ اس وقت سابعہ جماعت نہیں تھی۔

قابلِ قدر کام ہوگا۔ لیکن پھر وہی لا ابالی طبیعت کی نغمہ سنجیاں آڑے آگئیں اور ہم بلبلِ گلشنِ آفریدہ کی مسحور کن آواز کی نغمگی کے حصار میں قید ہو کر رہ گئے۔

بالآخر:

لائے تھے بت التجاء کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

تب اس کتاب کا ترجمہ نہ ہو سکا نہ سہی۔ اب کم سے کم اس موضوع پر کچھ کام تو ہو ہی سکتا ہے: پاس ہونے کی غرض سے ہی سہی۔

بہر حال، مقالہ پر کام شروع کر دیا ہے اور علمِ تفسیر کے تدوینی مراحل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، میں نے اپنے مقالے کو حسبِ ذیل ذیلی عناوین میں تقسیم کیا ہے:

۱. علمِ تفسیر کی تعریف و توضیح کے سلسلے میں واقع لغوی و اصطلاحی اختلافات اور ان کا تدارک
۲. تفسیر و تاویل کے مابین فرق اور اس کا تدارک
۳. علمِ تفسیر عہدِ رسالت میں: آقا کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کا طریقۂ تفسیر اور آپ کی تفسیر کے امتیازات
۴. علمِ تفسیر عہدِ صحابہ میں: صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا طریقۂ تفسیر اور ان کے تفسیری امتیازات
۵. علمِ تفسیر عہدِ تابعین میں: تفسیر کے حوالے سے تابعین علیہم الرحمۃ کا منہج اور اس کی خصوصیات
۶. علمِ تفسیر عہدِ تدوین میں: تدوینی دور میں علمِ تفسیر کے مختلف مراحل:

- کتبِ حدیث میں تفسیرِ قرآن کو محض ایک باب کی حیثیت سے ذکر کرنا
- تفسیر کی مستقل کتابوں کا مدون ہونا: مثلاً تفسیر ابنِ ماجہ و تفسیرِ طبری وغیرہما
- تفسیرِ قرآن میں اسرائیلیات کا کثیر تعداد میں شامل ہو جانا: جس کو اصولِ تفسیر کی اصطلاح میں 'الدخیل فی التفسیر' کہا جاتا ہے۔
- تفسیر بالرائے المحمود والمذموم کی بحث

ان تمام امور پر راقم نے اپنے مقالے میں روشنی ڈالی۔ اس تحقیق و تشریح میں قبلہ انٹرنیٹ نے بھی کافی مدد کی اور بہت سی ایسی کتابیں جو ہم مدرسے کی لائبریری سے کبھی نہیں لیتے، انٹرنیٹ پر باآسانی میّسر آگئیں۔ فالحمد للہ علیٰ

ذلک۔

مقالہ حضرت مولانا دلشاد صاحب کے پاس جمع کر چکا ہوں اور اب باقی امتحان کی تیاری میں مصروف ہوں۔

امتحان ختم ہوگئے کہ نہیں؟ جی ہوگئے۔ پھر رزلٹ کیا رہا؟ آپ ہی بتائیں، کیسا رزلٹ آیا ہوگا؟ میرے خیال میں اس بار بھی آپ ہی فرسٹ آئے ہیں۔ صحیح کہا؟ جی، آپ کے منہ میں گھی شکر۔ والسلام۔

بات کچھ بھی نہ ہو اور دل میں تماشا لگ جائے:

جس جماعت میں مجھے دو برس پہلے ہونا تھا۔ آج دو سال کا بَنواس کاٹ کر پھر اُسی جماعت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ وہ ساتھی جو اعدادیہ سے سادسہ تک ساتھ تھے اور سادسہ کے بعد جدا ہوئے، اب فارغ ہو کر جا چکے ہیں۔ ان پچھلے دو سالوں میں بہت کچھ بدلا ہے۔ مدرسہ بھی اور اس کے باہر کی دنیا بھی۔ اس فریبی دنیا سے بہت کچھ سیکھا ہے اور کچھ سکھایا بھی۔ کچھ فریب کھائے اور کچھ فریب خوردہ لوگوں کو ہوش کے ناخن بھی دئے۔ بہت سے گمنام درد ہیں جو بس ہیں۔ کیوں ہیں؟ یہ صرف ایک معمہ ہے۔ کچھ بڑھتے قدموں کو روک دیا گیا۔ کچھ تعبیر ہوتے خوابوں پر شب خون مار کر ہمیشہ ہمیش کے لئے سلا دیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوائے ایک سوالیہ نشان کے اور کچھ نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیجئے:

طلسمِ خواب زلیخہ و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

مختلف جماعتوں سے منتخب کردہ، افراد کو یکجا کر کے، اب کی بار 'تخصص فی الدعوۃ والتبلیغ' کے نام سے ایک نئے شعبہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ میرے تینوں ہم جماعت: تسلیم، ریحان اور کیف الحسن بھی ان منتخب افراد میں شامل ہیں۔ ان تینوں کے تخصص میں جانے کے بعد، سابعہ میں صرف میں بچا ہوں۔ خود کو جماعت میں اکیلا پا کر، ذہن ماضی کی شاہراہوں سے ہوتا ہوا، پھر اسی مقام پر جا کر کھڑا ہو گیا جہاں آج بھی، اس جملے کی بازگشت آ رہی ہے: "کہ صرف ایک انسان کے لئے، کسی جماعت کا قیام نہیں کر سکتے۔" اس بات کو تو دو سال ہوگئے ہیں، آپ اب تک وہیں اٹکے ہوئے ہیں۔ اٹکا نہیں ہوں، لیکن:

اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں

کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لئے ہیں

جذبوں کی جولانی، علم کی روانی—الملتقیٰ العلمی الاسلامی:

یاد داشت بخیر! مدرسے کی نشاۃ ثانیہ کے بعد سب سے پہلا مسابقہ ۲۰۰۷ء میں کرایا گیا تھا۔ جس میں مسابقۂ مقالہ نگاری، تقریر اور دیگر مسابقات شامل تھے۔تب سے لے کر آج تک مسلسل مسابقات کے انعقاد کا سلسلہ جاری ہے۔ عموما دن میں مسابقات ہوتے ہیں اور شام کو محفل تقسیم انعامات: جن میں کئی نامی اور علمی شخصیات کی شمولیت رہی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آرہا ہے ایسی ہی ایک محفلِ تقسیمِ انعامات میں مولانا ذیشان احمد مصباحی اور مولانا اشرف الکوثر بھی تشریف لائے تھے: جس میں عاصم بھائی کی عربی تقریر ہوئی تھی اور رضوان بھائی کی نظامت۔تاثرات کے دوران مولانا مصباحی نے کہا تھا کہ: "یہ دیکھ کر مجھے خاصی خوشی ہوئی کہ مدرسۂ ہٰذا کے طلبہ عربی زبان میں خطاب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنے مدارس کے طلبہ کو عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی کلام وخطاب کرنے کی صلاحیت سے لیس کر دیں تو یقینا یہ ایک بڑا کام ہوگا۔"

جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا کہ مسابقات کے انعقاد کے سالِ اول کے بعد سے، تقریبا ہر سال یکے بعد دیگرے مقابلاجات بھی منعقد ہوتے رہے ہیں اور اختلافی مسائل پر مباحثات و مناظرات کا انعقاد بھی عمل میں آتا رہا: جن میں تمام طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک دوسرے سے بہتر کارکردگی پیش کرنے کی کوشش کی۔ پچھلی بار منعقدہ مسابقۂ مقالہ نگاری میں راقم کو اول پوزیشن حاصل ہوئی تھی۔اس کے علاوہ اب تک دو مباحثوں میں بھی شرکت رہی ہے: جن میں سے ایک بنا کسی نتیجہ کے اختتام پذیر ہوا جبکہ دوسرے میں ہماری ٹیم کو فتح نصیب ہوئی تھی۔

اس سال بھی، سالانہ مسابقات کا آغاز ہو چکا ہے اور اب کی بار **"الملتقیٰ العلمی الاسلامی"** کے بینر تلے، ابھی کچھ دنوں میں دو فریقین کے درمیان ایک اختلافی مسئلے پر مباحثہ ہونا ہے، جس میں، مجھے بھی شامل کیا گیا ہے۔

مباحثے میں آمنے سامنے ہونے والیں، دونوں ٹیموں کے سپہ سالار و سپاہیوں کے اسماء حسبِ ذیل ہیں:

پہلی ٹیم:

۱. تسلیم: سپہ سالار

۲. عبد القدیر: نائب سپہ سالار

۳. میں (احمد سعید): پیادہ

دوسری ٹیم:

۱. سید وسیم: سپہ سالارِ اعلیٰ

۲. مخدوفِ منوی: سپہ سالار (ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو)

۳. محمد صابر: نائب سپہ سالار

مباحثہ کی میعاد آن پہنچی ہے اور آج صبح ۰۹ بجے ہال کمرے میں رن پڑنا ہے۔

سارے اساتذہ و طلبہ موجود ہیں اور اساتذہ کے بالکل سامنے دائیں اور بائیں طرف ایک ایک تپائی اور مائک رکھا ہے۔ اب ہال کمرے میں آج کے مجاہدین کی آمد آمد ہے۔ لیکن یہ کیا ہم تو سوچے ہوئے تھے کہ جیسے ہی ہماری انٹری ہوگی تو پورا ہال کمرہ مرحبا کی چھت شگاف صداؤں سے گونج اٹھے گا۔ لیکن یہاں تو طلبہ کی جانب سے بس زنانِ مصر سی چہ مے گوئیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ بھئی اب ہم تو ٹھہرے پیادے، اس لئے اس سب سے ہمیں تو کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ **"سرخرو ظلِ الٰہی ہی ہوں گے"** البتّہ اتنا کہنے کا حق تو بہرحال ہمیں بھی حاصل ہے کہ چلیں اِن لوگوں نے مرحبا نہ کہا کوئی بات نہیں، کم سے کم ایک سپہ سالارِ اعلیٰ، دو سپہ سالاروں اور دو نائب سپہ سالاروں کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی کی آواز سے آواز ملا کر:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

ہی کہہ لیتے۔ مگر نہیں۔۔ ہمم۔۔ ابھی میرے دماغ میں یہ سب چل ہی رہا تھا کہ اچانک میری نظر فریق مخالف کی صف میں بیٹھے بعض افراد پر پڑی، جن کو دیکھ کر بے ساختہ زباں سے نکلا:

شیخ بہ جبّہ و دستار؟ خدا خیر کرے

تو اب شروع ہوتا ہے مباحثہ۔ قرعہ اندازی کے ذریعے ایک کو سائل اور دوسرے کو مجیب کے مقام پر فائز کر دیا گیا ہے۔ سوال و جواب اور پھر جواب در جواب کا بازار گرم ہے اور مشارکین کے تیور دیکھ کر لگ رہا ہے کہ آج پانی پت

کی تیسری جنگ یہی ہال کمرے میں ہو گی۔ یہ کیا؟ ایک دم سے سناٹا ہو گیا۔ اس دلیل کی کاٹ نہیں ہو پا رہی ہے۔ مطلب ایک ٹیم جیت گئی؟ بتائیں، کونسی ٹیم جیتی؟ جن کو جیتنا تھا وہ جیت گئے۔ آپ آم کھائیں، گٹھلیاں نہ گنیں۔ ارے! پھر بھی بتاؤ تو کونسی ٹیم جیتی؟ آپ کی یا سامنے والی؟ ہار و جیت کی بات چھوڑیں کیونکہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔ اور فی الحال میرا خیال ہے، کہ باقی مسابقوں کی بھی بات ہونی چاہئے کیونکہ صرف مباحثہ کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

مباحثہ کے علاوہ، امسال ۲۰۱۳ء، میں **"الملتقیٰ العلمی الاسلامی"** کے عنوان کے تحت مسابقۂ ترجمۂ قرآن، مسابقۂ حفظ حدیث و اصول حدیث، مسابقۂ نحو و صرف، مسابقۂ تقریر، مسابقۂ سیرت و اکابر اسلام، مسابقۂ معلومت مسائل شریعت اور مقابلہ حفظ و تجوید منعقد ہوئے: جن میں سے مسابقۂ ترجمہ قرآن میں سید وسیم مجیدی، مسابقۂ حفظ حدیث و اصول حدیث میں تجمل حسن مجیدی، مسابقۂ نحو و صرف میں عبد العلیم مجیدی، مسابقۂ تقریر میں توصیف الحسن مجیدی، مسابقۂ سیرت و اکابر اسلام میں محمد زید، مسابقۂ معلومت مسائل شریعت میں محمد آزاد اور مقابلہ حفظ و تجوید میں مجاہد بیگ نے اول پوزیشن حاصل کی۔

آج رات ہونے والی محفلِ تقسیمِ انعامات میں، اول آنے والے تمام طلبہ کو حضرت اقدس کے دست اقدس سے اعزازی سند و شیلڈ سے نوازا جائے گا۔ محفل میں نظامت کے فرائض راقم الحروف کو سونپے گئے ہیں۔

بعد نمازِ عشاء مسجدِ خرمہ کے صحن میں محفل کا آغاز ہوا۔ بطور تمہید بحیثیت ناظم جلسہ، راقم نے بدایوں اور مدرسہ قادریہ سے فارغ ہونے والے عظیم جیالوں کی تاریخ پر ایک سرسری روشنی ڈالی۔ بعدہ، عبد القدیر مجیدی نے اردو اور عبد العلیم مجیدی نے عربی میں استقبالیہ پیش کیا جبکہ سید وسیم قادری مجیدی نے عربی میں خطاب کیا۔ اور اب بیرونِ شہر بدایوں سے تشریف لائے ہوئے ہمارے معزز مہمانان گرامی ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی علیگ، ڈاکٹر عبد السلام جیلانی (پروفیسر شعبۂ تاریخ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی)، مولانا سید غلام عبد الصمد چشتی صاحبان کو تاثرات پیش کرنی کی دعوت دینی ہے۔ لیکن ظاہر سی بات ہے، مجھے ان حضرات کے میدانِ عمل اور نمایاں خدمات کے حوالے سے کوئی علم نہیں ہے۔ جبکہ ان حضرات ذوی الاحترام کو زحمتِ کلام دینے سے پہلے، ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتانا ہو گا اور چونکہ صرف لفاظی سوائے کانوں کے بھانے کے اور کسی کام کی نہیں ہوتی ہے، اسی لئے شیخ صاحب نے ان تمام مہمانانِ گرامی کا تعارفی خاکہ مجھے پہلے ہی لکھ کر دے دیا ہے اور اب ان حضرات کو تاثرات و

انطباعات پیش کرنے کی دعوت دیتے ہوئے، میں اسی خاکے سے ان کا تعارف پیش کر رہا ہوں، وہ بھی ٹھیک اسی انداز میں جس انداز میں سیمینار میں مقالے کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

شیخ صاحب کے کلمات تشکر اور حضرت اقدس کے دعائیہ کلمات پر محفل کا اختتام ہوا اور اب میں گھر جا رہا ہوں۔

کل کی نظامت کے بعد، جب آج صبح مدرسے آیا ہوں تو اساتذہ اور ساتھیوں نے کافی حوصلہ افزا کلمات سے نوازا ہے۔ میں بھی مطمئن ہوں کہ بحمد اللہ اس بار پچھلی بار کی طرح کوئی گڑبڑی نہیں ہوئی۔

کچھ زیادہ ہی ملی جتنی محبت چاہی:

کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ سب کچھ کہہ دیا جائے — وہ باتیں بھی جو کبھی ہونٹوں پر نہ آئیں، وہ شکوے بھی جو ہم نے خاموشی کے کتبے تلے دفن کر دئے، اور وہ ہنسی بھی جس کا تعلق خوشی سے کم اور تھکن سے زیادہ ہوتا ہے۔ اب تک کے تعلیمی سفر سے مجھ پر یہ عقدہ تو کھل گیا کہ ہنسی صرف ہونٹوں کی جنبش نہیں، کبھی کبھی یہ دل کی آخری چیخ بھی ہوتی ہے — بس تھوڑی مؤدب، تھوڑی مہذب۔

احمد صاحب!، اب تک جو کچھ بھی آپ نے مجھے بتایا، اس کو سن کر مجھے ایسا لگتا ہے، کہ آپ کی یہ دیارِ شوق کی داستان صرف تعلیمی روداد نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں کچھ کرب بھی دفن ہیں اور رنجور واقعات بھی۔ دورانِ گفتگو، کئی مقامات پر میں نے آپ کی ہنسی کی دھن میں ایک خاموش شکوے کی چیخ بھی سنی ہے اور مسکراتی آنکھوں میں کچھ انجان مناظر کو دھندلاتے بھی دیکھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن:

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

آپ کی بات بجا ہے، لیکن شاید پردہ بھی خود بخود نہیں پڑا، کہیں نہ کہیں دل نے خود ہی اوڑھ لیا — کہ کچھ باتیں اگر کہہ دی جاتیں تو شاید سننے والا تھک جاتا، یا سمجھنے سے قاصر رہتا۔ لیکن اب، جب وقت کچھ بدل گیا ہے، اور الفاظ میں لرزش کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی روانی بھی در آئی ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب سنے جانے کا موسم آن پہنچا ہے۔

آج جب مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ سب کچھ، جو کبھی دل کی دیوار پر صرف سایہ بن کر چپ چاپ ٹکا رہا، اب دھیرے دھیرے لفظوں کی صورت لینے لگا ہے۔ کچھ باتیں جو پہلے صبر کی راکھ میں دبی ہوئی تھیں، اب خواہش کی لو پر تھوڑا تھوڑا سلگنے لگی ہیں۔ شاید یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اب شکوہ سننے والا صرف سامع نہیں، شاید مرہم رکھنے والا بھی ہے۔ پہلے جو ہنسی صرف تھکن کے وقفے کی طرح محسوس ہوتی تھی، اب اُس میں تھوڑا سا سچ بھی شامل ہو گیا ہے۔ اور دل —— جو پہلے فقط برداشت کا ایک پیالہ تھا —— اب اُسے تھامنے کے لیے ایک اور ہاتھ بھی محسوس ہوتا ہے۔

تعلیمی سفر اب بھی جاری ہے، لیکن اب اس میں تنہائی کا سناٹا نہیں رہا۔ وقت نے کچھ قدم ساتھ لگا دئے ہیں، اور کچھ فاصلوں کو آنکھوں کی نمی نے ناپ لیا ہے۔ اب اگر کچھ کہنا بھی ہو، تو دل ڈرتا نہیں —— بس سوچتا ہے کہ کہہ بھی دیا تو شاید اب بوجھ کم ہوگا، اور سننے والا بھی خاموشی کو محض توقف نہیں، گفتگو کا پہلا جملہ سمجھے گا۔

شاید اسی لئے اب ہنسی صرف تھکن کا سایہ نہیں، خاموشی، فقط اندھیرا نہیں کہ سفر کا وہ موڑ آ چکا ہے، جہاں باتیں کہنے کا موسم ہے۔ اور محبت؟ وہ اب بھی ہے، اور شاید اب کچھ سمجھنے والوں کے درمیان ہے۔ ہاں، کچھ زیادہ ہی ملی جتنی محبت چاہی تھی۔ لیکن اب وہ محبت، آزمائش نہیں، اک تسلی سی لگنے لگی ہے۔ البتہ شکوہ کیوں کیا اور زخم کیوں دکھائے تو اس کی وجہ، ابھی اپنے چچا غالبؔ سے پوچھ کر بتا دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے پھر بتائیں۔ چچا کہہ رہے ہیں کہ بھتیجے، پوچھنے والو سے کہہ دو کہ بلی بھی کبھی نہ کبھی تھیلے سے باہر آ ہی جاتی ہے، ہم تو پھر بھی آدم زاد ہیں۔ بس، اتنا سمجھ لو:

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

صداجو صور بن گئی:

۴/مارچ ۲۰۱۴ کو، میں اپنے گھر کے سامنے واقع بَر والی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھا کر ابھی گھر کے

دروازے سے اندر داخل ہی ہو رہا تھا کہ امی گھبرائی ہوئی، بھرّائی آواز میں بولیں: "بغداد شریف میں شیخ صاحب کو گولی لگ گئی ہے۔" اس سے پہلے کے ان کا جملہ پورا ہوتا، میں نے الٹے پاؤں مدرسے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہانپتا کانپتا جیسے ہی مدرسے کے گیٹ پر پہنچا تو ایک عجیب سوگوار فضا میرا انتظار کر رہی تھی۔ کافی طلبہ کیفے بغداد اور کچن کے باہر حلقہ بنائے، کچھ بات کر رہے تھے، جو میرے کانوں سے یوں گزری جیسے ہوا کی سرسراہٹ۔ راہداری سے ہوتا ہوا جیسے ہی آستانے کی طرف مڑا تو مولانا نبی رضا صاحب دل پر ہاتھ رکھے سسکیوں سے روتے نظر آئے، یہ دیکھ کر میرے قدم جوں کے توں رک گئے جیسے کسی نے لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہو۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی جب پیر آگے بڑھنے پر انکاری رہے تو میں وہی دیوار سے ٹک گیا اور دل و دماغ کو تسلی دینے لگا کہ صرف گولی ہی لگی ہے، بس زخمی ہو گئے ہوں گے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن دل کی تیز ہوتی دھڑکنیں، کپکپاتے ہونٹ، شل ہوتے ہاتھ پیر اور آنکھ سے باہر آنے کے منتظر آنسو، میری ہر تسلی کو جھٹلا رہے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ صرف گولی لگی ہے یا کچھ اور بات ہے۔ کس سے پوچھوں؟ کون صحیح بات بتا سکتا ہے؟ ابھی میں دیوار سے ٹِکا ان سوالوں سے جوجھ ہی رہا تھا کہ ایک ساتھی یہ کہتا ہوا گلے لگ کر رونے لگا کہ "بھائی، سب ختم ہو گیا"۔ یہ سننا تھا کہ میرے وجود میں بجلی سی دوڑ گئی، میری زبان پر ایسا گنگ طاری ہوا کہ میں اس سے پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھ پایا کہ بھائی پاگلوں جیسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟ کچھ نہیں ہوا ہے، ہمارے شیخ بس زخمی ہوئے ہیں، حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم کتنی دیر ہم دونوں یونہی گلے لگ کر روتے رہے لیکن اتنا یاد ہے کہ جب الگ ہوئے تو سامنے چبوترے سے عزام میاں نیچے آ رہے تھے، خبر کا بوجھ ایسا تھا کہ اُن کے دونوں کندھے جھکے ہوئے تھے، چال میں ایسی تھکن کہ گویا صدیوں کی بادیہ نوردی کے بعد کسی ویرانے سے پلٹے ہوں، ہر قدم جیسے ریت میں دھنس رہا ہو، جو اٹھتا نہیں بلکہ گھسٹتا ہے۔

اب تک گولی لگنے کی خبر شہر بھر میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل چکی تھی۔ بازار بند ہو گیا تھا۔ گھروں میں چولہے بجھ چکے تھے۔ مدرسے کے اندر اور باہر انسانوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ ہر چہرے پر حیرت، ہر آنکھ میں انکار کی نمی۔ سبھی کسی طرح اس خبر کو جھٹلانا چاہتے تھے، شاید امید کی آخری کرن باقی تھی۔ لیکن جو منظورِ خدا تھا وہی ہوا اور ہمارے کانوں نے وہ اعلان بھی سنا جو آج تک ایک ڈراؤنے خواب کی طرح راتوں کی نیند اڑا دیتا ہے؛ "شیخ صاحب، بغداد میں ایک دہشت گردانہ حملے میں گولی لگنے سے شہید ہو گئے ہیں۔"۔ چند الفاظ پر مبنی یہ سرسری سا

اعلان، ہمارے لئے صورِ اسرافیل سے کم نہ تھا۔ ذہن و دل، جان و جگر پر ایک جھماکہ سا ہوا اور سارے احساسات و جذبات پر وہ قیامت ٹوٹی کہ بس۔ سینکڑوں سسکیوں، گریہ و آہ زاری کا شور ایسا لگ رہا تھا جیسے موت کی ہچکی میں پگھلتی ہوئی کوئی آواز۔ در و بام پر وہ سناٹا تھا جیسے مدفن کی پہلی رات اتر آئی ہو۔(۱۰)

لوگ کہتے ہیں کہ : "دیواروں کے کان ہوتے ہیں"، میں سمجھتا ہوں کہ : صرف کان ہی نہیں، دیواروں کی زبان بھی ہوتی ہے —— چہرہ بھی، اور جذبات بھی۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب سے شیخ صاحب کی شہادت کی خبر آئی ہے، مدرسے کے در و دیوار پر ایک ایسی خاموشی طاری ہے جو سناٹے سے کہیں زیادہ بولتی ہے، ایسی بے کلی، ایسی بے چینی، جیسے عمارت کے ہر ذرّے میں ماتم گھل گیا ہو۔ ہر سمت ایک ایسا گونجتا ہوا سناٹا پھیل گیا ہے، جس کی بازگشت بہرے کانوں تک بھی پہنچتی ہے۔ یہ وہی در و دیوار ہیں جن کو میں ہنستے مسکراتے دیکھا ہے، ہماری خوشیوں میں چہچہاتے دیکھا ہے لیکن آج دیوار کا ہر پتھر ہمارے ساتھ گریہ کناں ہے، سوگوار ہے۔

٦/مارچ کو خبر آئی کہ آج بعد نماز عصر احاطۂ غوث اعظم میں شیخ صاحب کی تدفین ہے ۔ کل ۷/مارچ کو حضرت اقدس، عشقی صاحب اور حافظ صاحب بغداد سے روانہ ہوں گے اور ۸/مارچ کی صبح دہلی پہنچیں گے اور پھر وہاں سے بدایوں۔

۸/مارچ کو عصر میں حضرت اقدس خانقاہ تشریف لائے، تو لوگوں کے ہجوم کو دیکھتے ہوئے ہال کمرے میں نشست کا انتظام کیا گیا۔ آپ نے سب کو صبر کی تلقین کی اور اللہ کی رضا میں راضی رہنے کو کہا۔

چونکہ شیخ صاحب کی شہادت کی خبر ہندوستان کے اکثر و بیشتر اخبار و جرائد میں شائع ہوئی تھی، اس لئے مولانا مجاہد صاحب نے میرے ذمے اونلائن موجود ایسے تمام اخباروں کے تراشوں کو جمع کر کے فائل کرنے کی ذمہ داری سونپ دی، جس کو میں پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن دل یہ سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا ہے کہ اب وہ مسکراتا ہوا چہرہ پھر کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ جب جب یہ خیال آتا ہے بے چینی کی ایک لہر سارے وجود کو لرزا کر

(۱۰) شیخ صاحب کی شہادت کو دس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن آج بھی یہ سطریں لکھتے ہوئے؛ کئی بار انگلیاں کانپی ہیں، کئی بار آنکھوں کے آگے کا منظر دھندلایا ہے، وجہ صرف اتنی سی ہے کہ کچھ غموں کو بھلانے میں نہ شب و روز کے ہنگامے کامیاب ہوتے ہیں اور نہ ہی مدتیں درد کی لو کم کر پاتی ہیں۔

چلی جاتی ہے اور لب کپکپاتے ہوئے بس اتنا ہی بول پاتے ہیں:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ
تُو کُجا بہرِ تماشہ می روی

چہلم کے بعد مدرسے میں پڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن درسگاہیں بجھی بجھی سی ہیں اور اساتذہ و طلبہ مرجھائے۔ ایک خالی پن کا احساس ہے جو کسی طور پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔ حالانکہ شیخ صاحب ساری جماعتوں کو نہیں پڑھاتے تھے، لیکن پھر بھی اُنہیں آتے جاتے دیکھنا، ان کی آواز سننا۔ سلام کے بعد ان کا چبوترے پر چکر لگانا۔ نوٹس بورڈ دیکھنا اور خالی گھنٹی یا وقفے کے دوران چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ کر اساتذہ سے بات کرنا۔ مشرقی زینے سے ہو کر اوپر لائبریری میں جانا۔ یہ سب ہماری تعلیمی زندگی کا وہ ڈیلی روٹین تھا، جو ہماری صبح کو اُجلا کر دیتا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ سب اب بس ایک یاد بن کر رہ گیا اور پیچھے چھوڑ گیا ہے بس اداس راہیں اور گونجتا سناٹا۔

خدا خدا کر کے سال بیتا اور سالانہ امتحان کے بعد تعطیل کلاں ہو گئی۔

اُفقِ جدائی پر خوابوں کا قافلہ:

ابھی کل ہی کی تو بات ہے، جب میں نے پاپا کے ساتھ ایک چھوٹی سی اٹیچی لئے مدرسے کی دہلیز پر اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔ ابھی کل ہی تو میں نواب سے لڑ رہا تھا۔ ابھی ابھی تو نظر العابدین نے میرے تالے کی چابی چھپائی تھی اور واپس دینے کی عوض کنستر میں رکھے نمکین بسکٹ مانگے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو صابر سے چاچا چودھری اور سابو کی کامِکس لے کر پڑھی تھی۔ کچھ دن ہی تو ہوئے ہیں جب "دمشق کے قید خانے میں"، پڑھ کر نصیر اور میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ابھی ابھی تو میں قالین کے نیچے چھپائی گئی شرح مأۃ عامل کی شرح ڈھونڈھ کر لایا تھا۔ پھر یہ اچانک فضیلت کا آخری سال کیسے آگیا؟ اور۔۔اور، میں اکیلا کیوں ہوں؟ نواب، نصیر، سفیان، قابض ـــــ یہ سب کہاں ہیں؟ یہ سب تو میرے ہم جماعت تھے پھر میں اکیلا اس درجے میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا یہ سب جا چکے ہیں؟ یہ وقت اتنی تیزی سے کیسے بیت سکتا ہے؟ کوئی اسے کچھ کہتا کیوں نہیں ہے؟ یہ کیوں لوگوں کے حسین لمحات کو ایک

آن میں یاد بنا کر آگے بڑھ جاتا ہے؟ کیا اس کے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا اس کے کوئی یار دوست نہیں ہیں؛ جن کی یاد اس کو کچھ دھیما کر دے، جن کے ساتھ بتائے لمحات اس کو سمجھائیں کہ دوستوں سے الگ ہونا کیسا کربناک تجربہ ہوتا ہے۔ حال کو ماضی بنتا دیکھنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یاروں کی جدائی کا خدشہ کیسے خون کے آنسو رلاتا ہے۔ لیکن افسوس وقت تمام جذبات سے عاری ایک سفاک طبیعت دورانیہ ہے۔ اس سے شکوہ ایک بے بس کی فریاد، یاد کا نوحہ اور وقت کے خلاف ایک مظلوم احتجاج سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور شاید یہی وقت کا سب سے بڑا فریب ہے—— کہ وہ ہمیں ہنساتا ہے، رلاتا ہے، اور پھر خاموشی سے سب کچھ لے کر آگے بڑھ جاتا ہے؛ اور ہم؟ ہم صرف اپنی عمرِ گزشتہ کی میت کو کندھا دیتے رہ جاتے ہیں۔

تعلیمی سال کا باضابطہ آغاز ہو چکا ہے۔ بخاری شریف، مسلم شریف، نسائی شریف اور توضیح تلویح۔ امسال شامل درس ہیں۔ میرے ثامنہ میں اکیلا ہونے کی وجہ سے، تخصص فی الفقہ والدعوۃ کے طلبہ کو بھی میرے ساتھ کر دیا گیا ہے؛ جس سے کم از کم درجہ بھرا بھرا لگتا ہے اور پچھلے برس کی طرح اس بار مجھے تنہائی سے دوستی نہیں گانٹھنی پڑے گی۔

حسبِ معمول سب کلاسز چل رہے ہیں۔ لیکن ابھی بھی شیخ صاحب کی شہادت کے غم سے ابھر نہیں پائے ہیں۔ ابھی بھی لگتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ صرف اور صرف ایک برا خواب ہے اور جیسے ہی ہم اپنی آنکھیں کھولیں گے، سب کچھ پہلے جیسا ملے گا۔ کبھی کبھی پورے پورے گھنٹے آپ کی یادوں اور باتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ ابھی بھی اس سانحہ کو حقیقت نہیں تسلیم کر پا رہے ہیں۔

تعلیمی سال اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور ہر گذرنے والا دن ایک طرف تکمیلِ فضیلت کی تہنیت پیش کر رہا ہے تو دوسری طرف دروازۂ دل پر جدائی کی دستک دے رہا ہے۔ دستک، جو باعثِ خلجان و بیقراری ہے۔ دستک، جو سببِ دل آزاری ہے۔ دستک، جو موجبِ بے تابی و بے آرامی ہے۔ دستک، جو بے چینی، دلگیری، آزردگی، سراسیمی، اضطراب اور نا جانے کون کون سے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے۔ گو کہ ابھی تو مادرِ علمی کا وصل میسر ہے، لیکن دل پر سایہ فگن جدائی کی گھٹائیں بتا رہی ہیں کہ یہ نعمت زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہے گی۔ اب بیچارہ دل بھی کتنا عذرِ واماندگی کرے۔ کب تک حقیقت سے نظریں چرائے۔ کب تک ستم ظریفئ وقت کا شکوہ کرے۔ مہ و سال اور ساعت و ثوانی کو روکنے کی سعی بھی اب خستہ جانی کا نوحہ بن چکی ہے۔ اب نہ تو

شکوہ سنجی کام آنی ہے اور نہ اشک فشانی۔ وقت اپنی چال چل چکا ہے اور ہم یہ بازی ہار چکے ہیں۔ مگر اس ہار میں بھی ایک خوشبو بسی ہوئی ہے——یادوں کی، محبتوں کی، اور ان لمحات کی جو کبھی پھر نہیں لوٹیں گے، مگر ہمیشہ دل میں زندہ رہیں گے۔

آہ! یہ دن بھی کیا دن ہیں——جب صبحیں مؤذن کی اذان اور سناٹے میں گونجتی دعاؤں کے سائے میں طلوع ہوتی ہیں، اور شامیں درسگاہوں کی زینت بن کر دل کے دامن میں علم و عرفان کے ستارے بکھیر دیتی ہیں۔ صحنِ مدرسہ کی مٹی میں ایک ایسا سحر رچا بسا ہے کہ جو بھی یہاں چلتا ہے، اس کے قدموں سے معرفت کی خوشبو اٹھتی ہے۔ یہ اساتذہ—— محض علم بانٹنے والے نہیں، بلکہ دلوں کے زخموں پر مرہم رکھنے والے، زندگی کے خاموش رہنما، اور کردار کے معمار ہیں۔ ان کی ہر ڈانٹ میں شفقت چھپی ہوتی ہے، اور ہر تعریف کے پیچھے دعاؤں کی ایک خاموش لڑی بندھی ہوتی ہے۔ ان کے چہرے الفاظ سے زیادہ بولتے ہیں، اور ان کی خاموشی طالب علم کے دل کو سنوار دیتی ہے۔ لیکن وائے رے ستم! کہ زندگی کے یہ حسین لمحات بس کچھ دن کے مہمان ہیں۔

یادیں ایک ایک کر کے دل کے دریچے کھٹکھٹا رہی ہیں——وہ دیر سے آنے پر ملنے والی خفگی، وہ سبق یاد نہ ہونے پر نظریں جھکانا، وہ سردیوں کی دوپہر میں دھوپ سینکتے ہوئے سبق پڑھنا۔ ہر لمحہ، ایک چراغ کی مانند ہے، جو دل کے حجرے میں جلتا ہے اور جدائی کی تاریکی کو تھوڑا تھوڑا کم کرتا ہے۔

کیسے بھلائے جائیں گے وہ ہم نفس، ہم قدم، ہم راز ساتھی——جن کے ساتھ دن صرف وقت نہیں تھے، بلکہ جیتے جاگتے قصے تھے۔ کوئی خوش مزاج، کوئی خاموش طبع، کوئی شوخ و شریر، اور کوئی سنجیدگی کا پیکر۔ سب نے اپنی اپنی جگہ دل میں ایک گوشہ بنا لیا ہے۔ وہ اجتماعی مطالعے کی راتیں، امتحانوں سے پہلے کی بے چینی، سوالوں کے جوابات پر بحث، اور پھر وقفے میں ہنسی کا طوفان——یہ سب اب ماضی کے البم میں قید ہو چکے ہیں، لیکن دل کے ورق آج بھی انہیں بار بار پلٹتے ہیں۔

آج سبق کا آخری دن ہے اور اگلے ہفتے سے سالانہ امتحان کی تیاری شروع ہو جائے گی۔ اس وقت مدرسے میں، ہمارے تعلیمی سفر کا آخری سبق جاری ہے، مگر دل کسی اور ہی سبق میں گھرا ہوا ہے——جدائی کا پہلا سبق! کوئی آنکھوں میں چھپے آنسوؤں کو محسوس کر رہا ہے، تو کوئی زبردستی ہنسی لبوں پر سجائے ہوئے ہے۔ کوئی خاموشی سے نصیحتوں کو دل میں اتار رہا ہے۔ وہ کلاس روم، جہاں برسوں بیٹھے، آج اچانک اجنبی سا لگ رہا ہے۔ وہ تپائی، وہ

الماری، وہ کھڑکیاں——سب کچھ جیسے الوداعی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہوں۔ آج کا دن کوئی عام دن نہیں—— آج دل کے ایک عہد کا اختتام ہے، اور زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز۔

افسوس راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی
صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

بزمِ خرابات کی آخری صدا:

سالانہ امتحان ختم ہو چکا ہے۔ رات کا سناٹا دھیرے دھیرے مدرسے کے در و دیوار پر اتر آیا ہے۔ سید صاحب، توصیف، صابر، ضمیر اور میں، ثامنہ کے درجے میں بیٹھے، حسبِ معمول، آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی شعر، کبھی کسی قصے کا ٹکڑا، کبھی کوئی بھولا ہوا واقعہ۔ سید صاحب کا قہقہہ ہمیشہ کی طرح بلند ہے، مگر آج اس میں کہیں ایک تھکن سی ہے۔ صابر خاموشی سے کچھ لکھ رہا ہے، جیسے ہر لفظ کے ساتھ اپنے دل کے کسی کونے کو خالی کر رہا ہو۔ توصیف شعر سنانے پر اصرار کر رہا ہے، لیکن آواز میں چمک کم اور لرزش زیادہ ہے۔

وقفے وقفے سے سب ہنس رہے ہیں، مگر ہنسی میں ایک ادھورا پن ہے۔ جیسے دل چاہے کہ وقت یہیں تھم جائے۔ جیسے ہر کوئی جانتا ہو کہ کل کچھ بدلنے والا ہے——لیکن کوئی بھی پہلے یہ اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں خوشی کی چھتری کے نیچے جدائی کا سایہ پھیلنے لگتا ہے۔

میاں! ساغر صدیقی کی یہ غزل سنیں:

جذبۂ سوزِ طلب کو بیکراں کرتے چلو
کُو بہ کُو روشن چراغِ کارواں کرتے چلو
چشمِ ساقی پر تبسم، میکدہ بہکا ہوا
آؤ قسمت کو حریفِ کہکشاں کرتے چلو

سید صاحب یہ شعر بطورِ خاص:

زندگی کو لوگ کہتے ہیں برائے بندگی
زندگی کٹ جائے گی ذکرِ بُتاں کرتے چلو

ابھی میں غزل کے تین ہی اشعار سنا پایا تھا کہ کسی نے آہستہ سے کہا: "کل سب اپنے اپنے راستے نکل جائیں گے"۔ سید صاحب بول پڑے، اماں یار، یہ سب چھوڑو۔ احمد سعید تم شعر سناؤ۔ قبلہ، محترم نے سارا موڈ خراب کر دیا۔ اب اسی اداسی والے رنگ کا شعر سنیں:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

واہ! یہ شعر تو ہماری موجودہ حالت کی بہترین عکاسی کر رہا ہے۔ صابر اس کو بلیک بورڈ پر لکھو۔ پھر کسی نے دھیرے سے کہا، "کیوں نہ ہم خود بھی کچھ ایسا کہنے کی کوشش کریں؟" سب نے تکبندی میں حصہ لیا، باتوں باتوں میں الفاظ جُڑتے گئے، اور آخر کار سید صاحب اور میرے تال میل سے ایک شعر وجود میں آگیا۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ ہم سب اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور بلیک بورڈ پر وہ شعر خاموشی سے لکھا رہ گیا:

ساقیا شاد رہے میکدہ آباد رہے
ہم تو جاتے ہیں مگر بزمِ خرابات رہے

***